مئی ۲۰۰۴ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تالیف

جسے بجا طور پر سلسلہ اقبالیات میں ''بقامت کہتر و لے بقیمت بہتر''
کی مصداق کامل قرار دیا جا سکتا ہے

علامہ اقبال اور ہم

مع

فکر اقبال کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ کا جائزہ
اور ہماری قومی ذمہ داریاں

☆☆☆

۞ حیات و سیرتِ اقبال ۞ فلسفۂ اقبال
۞ ملتِ اسلامیہ کے نام علامہ اقبال کا پیغام

(از قلم : پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

☆☆☆

۞ اقبال اور قرآن' (از قلم : سید نذیر نیازی)

قارئین کی سہولت کے لئے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ بھی شامل کتاب کیا گیا ہے

قیمت: اشاعت خاص (سفید کاغذ' پائیدار و خوبصورت جلد) 72 روپے

اشاعت عام: (نیوز پیپر ایڈیشن) 30 روپے

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 03-5869501' فیکس: 5834000

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِىْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

جلد: 53
شمارہ: 5
ربیع الاوّل 1425ھ
مئی 2004ء
فی شمارہ 15/-

مدیر مسئول
ڈاکٹر اسرار احمد

مجلس ادارت
حافظ عاکف سعید
سید قاسم محمود
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

- اندرون ملک 150 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 800 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1000 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700 فون 03-5869501
فیکس: 5834000 ای میل: anjuman@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ گڑھی شاہو علامہ اقبال روڈ لاہور
فون: 6316638-636638 فیکس: 6305110
پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

✿ **عرض احوال** ——— 3

حافظ عاکف سعید

✿ **ظروف و احوال** ——— 6

ملکی وملی مسائل پر تنظیم اسلامی کا نقطۂ نظر

✿ **مطالعہ قرآن حکیم** 9

اسوۂ رسول: سورۃ الاحزاب کی آیات کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

✿ **ہماری دعوت** ——— 29

تنظیم اسلامی کی دعوت

شاہد اسلم محمد

✿ **منہاج المسلم** (۳۶) ——— 43

o مسلمان کا طرزِ حیات

علامہ ابوبکر جابر الجزائری

✿ **قرآنیات** ——— 55

''تفسیر بالرائے'' کے ضمن میں علماء محققین کا موقف

سید اخلاق حسین قاسمی

✿ **من الظلمت الی النور** ——— 58

قادیانیت سے اسلام تک

زیڈ اے سلہری

✿ **گوشہ خواتین** ——— 71

تحریک آزادی نسواں: تہذیب جدید کے مضمرات

ڈاکٹر شمشاد امتیاز

✿ **عالم اسلام** ——— 81

انڈونیشیا

سید قاسم محمود

❁ ❁ ❁

عرضِ احوال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہمارے لئے واحد پناہ گاہ

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ پاکستان اس وقت مشکل ترین حالات سے دوچار ہے۔ امریکہ ایک بدمست ہاتھی کی طرح پہلے افغانستان اور پھر عراق کو روندنے کے بعد اب پاکستان کی سرزمین پر فوجیں اتارنے اور ہمیں اپنے قیمتی ایٹمی اثاثوں سے محروم کرنے کے بہانے تلاش کر رہا ہے۔

امریکہ کے شدید دباؤ کے باعث ہم جنوبی وزیرستان میں فوجی کارروائی کرنے اور اپنے بے گناہ قبائلی بھائیوں کا قتل عام کرنے پر مجبور ہوئے ہیں' حالانکہ ہم خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ اپنے قبائلی عوام کو ناراض کرنا پاکستان کے حق میں انتہائی نقصان دہ ہے۔

اپنے ایٹمی اثاثوں کو بچانے کی کوشش میں ہم نے 11 ستمبر 2001ء کے بعد پہلے اپنی افغان پالیسی اور طالبان حکومت کو امریکہ کے چرنوں پر قربان کیا' پھر جہاد کشمیر پر اپنے موقف سے دستبرداری قبول کی' اور کشمیر پالیسی کو قربانی کی بھینٹ چڑھایا' بعدازاں اپنے قابل احترام ایٹمی سائنس دانوں کو قربانی کا بکرا بنا کر پوری دنیا کے سامنے ذلت و رسوائی کا نشان بنا قبول کیا اور اب وانا میں شرمناک فوجی آپریشن کے ذریعے اپنے لئے جگ ہنسائی کا سامان پیدا کیا—— لیکن سب جانتے ہیں کہ خطرہ ابھی تک ٹلا نہیں ہے' بلکہ آج ملک کے تمام اصحاب علم و دانش حالات کے اس تجزیے پر متفق نظر آتے ہیں کہ امریکہ نہ صرف پاکستان کے شمال مغربی سرحدی علاقوں میں اپنی فوجیں اتارنے اور عراق کی طرح کی کارروائی کرنے پر تلا ہوا ہے بلکہ وہ ہر قیمت پر پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر بھی اپنا کنٹرول چاہتا ہے۔—— افغانستان اور عراق میں کشت و خون کا بازار گرم کرنے کے بعد اب اس کا اگلا ہدف پاکستان ہی ہے۔ گویا اب ہمیں امریکہ کو خوش رکھنے اور اس کی شرانگیزی سے بچنے کے لئے اپنی خودمختاری اور اپنے ایٹمی پروگرام کی خود اپنے ہاتھوں (بقول صدر مشرف ''کسی دباؤ کے بغیر'') قربانی دینا ہوگی' ورنہ یہ قدم خود امریکہ اٹھائے گا۔ اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ اگر ہم خدانخواستہ اپنے ایٹمی اثاثوں سے محروم کر دیئے گئے تو پھر شدید اندیشہ ہے کہ ہم ہندوستان کے تنگ نظر متعصب ہندو کے رحم و کرم پر ہوں گے جو مسلمانوں کے خلاف شدید انتقامی جذبات اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے—— مسلمانوں کے ازلی دشمن یہود اور ہنود آج امریکہ کے تعاون سے پاکستان کا وجود مٹانے کے درپے ہیں—— ہمارے اجتماعی جرائم کی سزا شاید ہمارا مقدر بن چکی ہے۔ قریباً 57 سال قبل ہمیں اللہ تعالیٰ نے انگریز اور ہندو کی دوہری غلامی سے نجات دلائی تھی اور پاکستان کے نام سے ایک آزاد خطۂ زمین ہمیں عطا کیا تھا' تاکہ ہم وہاں ایک سچی اسلامی فلاحی ریاست قائم کریں اور دین و شریعت کو قائم و نافذ کریں' لیکن ہم اپنے دین اور اپنی منزل کو بھلا کر دنیا داری اور نفس پرستی کے چکر میں پڑ گئے اور علامہ اقبال کے اس شعر کی عملی تصویر بن گئے کہ۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود!

ہمارا اصل جرم اللہ کے ساتھ وعدہ خلافی اور اللہ کے دین کے ساتھ بے وفائی ہے' جو گزشتہ نصف صدی سے جاری ہے۔ جس کے نتیجے میں ذلت و مسکنت کا عذاب ہم پر مسلط کر دیا گیا جو اس سے پہلے ایک طویل عرصے تک یہود کا مقدر تھا۔ چنانچہ سیاسی ابتری اور معاشی بدحالی آج تک ہمارا مقدر بنی رہی ہے اور اب ہماری آزادی و خودمختاری' ہمارا اسلامی تشخص اور ہمارا ایٹمی پروگرام شدید خطرات سے دوچار ہے۔ بقول اقبال۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے نہیں کرتی کبھی ملت کے گناہوں کو معاف!

سورۃ الحدید آیت 16 کے الفاظ میں:

''تو کیا اب بھی اہل ایمان کے لئے وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر اور جو کچھ اللہ تعالیٰ نے حق کلام نازل فرمایا ہے' اس کے سامنے جھک جائیں!''

قومی زندگی کے اس نازک ترین موڑ پر

امریکی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لئے ربِّ کائنات کی مدد کا حصول ہی ہمارے بچاؤ کا واحد راستہ ہے!

آیئے! اپنے رب کو راضی کرنے اور اس کے سایۂ رحمت میں آنے کی خاطر
اپنے سابقہ گناہوں پر اپنے رب سے استغفار کرتے ہوئے

عہد کریں کہ آئندہ ہم:

1) زندگی کے ہر گوشے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی تعلیمات پر عمل کریں گے اور ہر اس چیز کو چھوڑ دیں گے جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے منع فرمایا ہے۔ چنانچہ:
   i) ہمارے دین نے جو حقوق اللہ اور حقوق العباد معین کر دیئے ہیں ان سب کو ادا کرنے کی ہر ممکن کوشش کریں گے۔
   ii) تمام حرام باتوں سے بچیں گے، خصوصاً سود اور جوئے کی ہر شکل سے مکمل اجتناب کریں گے اور حلال روزی پر اکتفا کریں گے۔
   iii) مغربی طرزِ معاشرت کو چھوڑ کر رسول آخر الزماں ﷺ کے اسوہ اور سنت کو اپنی زندگی میں رائج کریں گے۔
2) نہ صرف یہ کہ ذاتی زندگی میں اسلام کی تعلیمات پر عمل کریں گے بلکہ ملک خداداد پاکستان میں نظام خلافت یعنی محمد مصطفیٰ ﷺ کے عطا کردہ عادلانہ اجتماعی نظام کے قیام اور شریعت کے مکمل نفاذ کے لئے بھی مل جل کر جدوجہد کریں گے اور اس راہ میں اپنا تن من دھن نچھاور کریں گے۔ اس لئے کہ رب کی رحمت و نصرت حاصل کرنے کا یہی یقینی طریقہ ہے۔

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں!

کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس توبہ کو قبول کرتے ہوئے قوم یونسؑ کی طرح اُس عذاب کو ہم سے ٹال دے جو آج ہمارے سر پر مسلط ہے! اس لئے کہ اگر ہمیں اللہ کی نصرت و حمایت حاصل ہو جائے تو دنیا کی کوئی طاقت ہم پر غالب نہیں آ سکتی۔

کیا ڈر ہے اگر ساری خدائی ہے مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لئے ہے!

ملکی وملی مسائل پر تنظیم اسلامی کا نقطۂ نظر

مسجد دارالسلام باغ جناح لاہور میں خطاباتِ جمعہ کے آئینہ میں

(۱)

''قضیہ فلسطین کا تاریخی پس منظر اور اس کا ہولناک مستقبل''

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد کا ۱۶ر اپریل کا خطابِ جمعہ

جس طرح آج ارض فلسطین جیسے چھوٹے سے خطے پر دنیا کی کئی اقوام باہم دست و گریباں ہیں' اس کی کوئی دوسری نظیر پوری تاریخ انسانی میں موجود نہیں۔ فلسطین کے قضیئے کا پس منظر یہ ہے کہ ایک طرف یہود اس ارض مقدس پر ناجائز قبضہ جمانا چاہتے ہیں' جس کے لئے انہیں امریکہ جیسی سپر پاور کی مکمل تائید وحمایت حاصل ہے۔ اس معاملے میں پروٹسٹنٹ عیسائی بھی ان کے ساتھ ہیں جن کا نمائندہ امریکہ ہے۔ جبکہ دوسری طرف کیتھولک عیسائی جو یورپ کی نمائندگی کرتے ہیں خود اس ارض مقدس پر کیتھولک حکومت کے قیام کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہود اس سرزمین پر ناجائز طور پر قابض ہوئے ہیں اور اس سرزمین پر ان کا دعویٰ بے بنیاد اور ظلم پر مبنی ہے' جبکہ یہاں کے حقیقی وارث فلسطینی مسلمان اسرائیل کے ہاتھوں کئی دہائیوں سے مظالم سہہ رہے ہیں۔ یہود کا ایجنڈا یہ ہے کہ اس سرزمین سے مسلمانوں کا صفایا کر کے یہاں یہودی ریاست قائم کی جائے اور مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ کو مسمار کر کے تیسرا ہیکل سلیمانی تعمیر کیا جائے۔ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لئے وہ پوری دنیا کو اس بڑی جنگ کی آگ میں دھکیلنے کو تیار ہیں جسے انجیل میں آرمیگاڈان اور صحیح احادیث میں الملحمۃ العظمیٰ کہا گیا ہے۔ یہ جنگ اب سر پر کھڑی ہے کیونکہ اسرائیل اپنے ایجنڈے کی تکمیل کے لئے بے چین ہے۔ دوسری طرف پروٹسٹنٹ عیسائیوں کے بقول یورپ بھی آخری صلیبی جنگ کی تیاری کر رہا ہے' جس کا مظہر یہ ہے کہ یورپ نہ صرف متحد ہو رہا ہے بلکہ اپنی علیحدہ فوج کے قیام کی تیاری بھی کر رہا ہے تاکہ امریکہ کے چنگل سے آزاد ہو کر یورپ خود فلسطین کو فتح کر کے وہاں

کیتھولک عیسائی حکومت قائم کر سکے۔ اس کشمکش کے نتیجے میں پوری دنیا میں خوفناک خون ریزی ہو گی کیونکہ مسلمان بالخصوص عرب نوجوان مسجد اقصیٰ اور گنبد صخرہ کے انہدام کو کبھی برداشت نہیں کریں گے۔ البتہ اس معاملے کا افسوسناک پہلو یہ ہے کہ ان مسلمان نوجوانوں کی طرف سے یہودی اور امریکی مظالم کے خلاف جو ردعمل ہو گا اس پر انہیں شاہ فہد اور حسنی مبارک جیسے امریکی ایجنٹ حکمران خود قتل کریں گے۔ یوں اس جنگ میں ایک طرف امریکہ' یہود اور یورپ کے ہاتھوں خونِ مسلم کی ارزانی ہو گی تو دوسری طرف وہ اپنے ہی ہم مذہب حکمرانوں کے مشق ستم کا نشانہ بنیں گے۔ البتہ احادیث سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ بہت بڑے نقصان کے بعد بالآخر فتح اہل ایمان کو حاصل ہو گی اور باطل کا غرور خاک میں مل جائے گا۔

(۲)

''نصاب تعلیم کی اصلاح''

امیر تنظیم اسلامی حافظ عاکف سعید کا ۹/اپریل کا خطاب جمعہ

نصاب تعلیم کو تبدیل کرنے کا منصوبہ پاکستان کی جڑوں پر تیشہ چلانے کے مترادف ہے۔ کون نہیں جانتا کہ پاکستان کی بنیاد بھی اسلام ہے اور منزل بھی اسلام ہے۔ مصورِ پاکستان اور معمارِ پاکستان دونوں کے نزدیک قیام پاکستان کی جدوجہد کا ہدف ایک حقیقی فلاحی جمہوری اسلامی ریاست کا قیام تھا۔ قائداعظم سے جب بھی یہ سوال کیا گیا کہ پاکستان کا دستور کیا ہو گا تو انہوں نے ہمیشہ یہ فرمایا کہ ہمارا دستور قرآن ہے۔

لیکن موجودہ حکومت دانستہ یا نادانستہ طور پر عالمی اسلام دشمن طاقتوں کی آلہ کار بن کر پاکستان کے اسلامی تشخص کو مٹانے کے درپے ہے۔ چنانچہ نصابِ تعلیم میں تبدیلی کے ضمن میں سفارشات پر مبنی جو رپورٹ حکومتی سطح پر زیر غور ہے اس میں قومی ہدف (National Goal) کا تعین جن الفاظ میں کیا گیا ہے وہ واضح طور پر اس بات کی چغلی کھاتے ہیں کہ نصاب تعلیم میں تبدیلی کے ذریعے دراصل پاکستان کے اسلامی تشخص کو مٹانا پیش نظر ہے۔ رپورٹ کے مطابق ہمارا قومی ہدف ''ایک ترقی پسند' اعتدال پسند' جمہوری پاکستان'' کا قیام ہے' حالانکہ معمار پاکستان ہمیشہ ''ایک فلاحی جمہوری اسلامی ریاست'' کے قیام کی بات کرتے رہے۔ ویسے بھی دوقومی نظریہ کی بنیاد پر تحریک پاکستان کا چلنا اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ

پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے جس کی بنیاد ہمارا مذہب یعنی اسلام ہے۔ ہمارے دشمن خوب جانتے ہیں کہ اس ملک کا وجود ختم کرنے کے لئے اس کی نظریاتی اساس کی جڑیں کھودنا ضروری ہے۔ اسی لئے ان کا دباؤ ہے کہ یہاں نصاب تعلیم کو از سر نو مرتب کیا جائے' جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ نصاب تعلیم سے اسلامی روح کو یکسر نکال پھینکا جائے۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہمارے حکمران پاکستان کی نظریاتی جڑیں کھودنے کے اس عمل میں پاکستان کے دشمنوں کے ہمنوا بن گئے ہیں۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ پاکستان کی منزل اگرچہ پہلے دن سے معین تھی لیکن ملک کے مقتدر طبقات نے ہمیشہ مجرمانہ غفلت کا ثبوت دیتے ہوئے پاکستان کی نظریاتی بنیادوں کو مستحکم کرنے اور پاکستان کی منزل یعنی اسلام کے مطابق نصاب تعلیم کو مرتب کرنے میں نااہلی اور تساہل کا ثبوت دیا۔ گزشتہ نصف صدی سے ملک میں تین چار قسم کے نظام تعلیم رائج ہیں۔ ہماری سیاسی ابتری' معاشی بدحالی اور قومی خلفشار کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ ہم نے اپنی منزل کی طرف فیصلہ کن انداز میں پیش رفت کرنے کی بجائے ملک کی نظریاتی بنیادوں کو کمزور سے کمزور تر کرنے والے اقدامات کئے' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج آزادی کی دولت ہمارے ہاتھوں سے پھسل رہی ہے اور ہم ہر معاملے میں امریکی ڈکٹیشن کے پابند ہیں۔ ہمارا قومی بجٹ تو پہلے ہی آئی ایم ایف اور ورلڈ بنک تشکیل دیا کرتے تھے' اب نصاب تعلیم بھی ''امریکی ہدایات'' کی روشنی میں ترتیب دینے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ گویا ہم اپنی آزادی سے دستبرداری کا فیصلہ کر چکے ہیں اور قومی سطح پر خودکشی پر تلے ہوئے ہیں۔

نصاب تعلیم کی اصلاح یقیناً ضروری ہے۔ لیکن یہ اصلاح اس نقطہ نگاہ سے ہونی چاہئے کہ ہمیں اپنے قومی ہدف یعنی ''ایک فلاحی جمہوری اسلامی ریاست'' کی طرف پیش قدمی کرنی ہے اور اپنی نظریاتی جڑوں کو مضبوط بنانا ہے۔ ہمیں اس معاملے میں مفکر و مصور پاکستان کی تعلیمات کو اپنے سامنے رکھنا ہوگا' جنہوں نے فرمایا تھا۔

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ

موجودہ حکمرانوں سے ہماری درخواست ہے کہ وہ قوم کی تقدیر کے فیصلے اپنے ہاتھ میں لینے کی بجائے پارلیمنٹ میں ان اہم معاملات کو غور و فکر اور فیصلے کے لئے پیش کرے —— ورنہ پوری قوم کی تباہی و بربادی کا جرم موجودہ حکمرانوں کی گردن پر آئے گا۔

اُسوۂ رسول ﷺ

سورۃ الاحزاب کے تیسرے رکوع کی روشنی میں ☆

ڈاکٹر اسرار احمد

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم ..... امّا بعد:

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرّجیم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۞ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۞ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۫ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ۞ لِيَجْزِيَ اللّٰهُ الصّٰدِقِيْنَ بِصِدْقِهِمْ وَيُعَذِّبَ الْمُنٰفِقِيْنَ اِنْ شَآءَ اَوْ يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۞ وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِغَيْظِهِمْ لَمْ يَنَالُوْا خَيْرًا ۭ وَكَفَى اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ الْقِتَالَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيْزًا ۞ وَاَنْزَلَ الَّذِيْنَ ظَاهَرُوْهُمْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ صَيَاصِيْهِمْ وَقَذَفَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ وَتَاْسِرُوْنَ فَرِيْقًا ۞ وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ۞﴾ (آیات ۲۱ تا ۲۷)

☆ سورۃ الاحزاب کی آیات ۲۱ تا ۲۷ پر مشتمل یہ درس محترم ڈاکٹر صاحب حفظہ اللہ نے اپنے مسلسل درس قرآن کریم کے دوران جامع القرآن قرآن اکیڈمی میں مئی ۱۹۷۹ء میں دیا۔

خطبۂ مسنونہ' تلاوتِ آیات اور ادعیۂ ماثورہ کے بعد:

حضرات! ان آیات پر ہماری گفتگو دو حصوں میں ہوگی۔ ایک تو ان شاء اللہ ہم درس کی صورت میں اس رکوع کو ختم کریں گے۔ پھر اس رکوع میں اسوۂ حسنہ سے متعلق جو مضامین آئیں گے' ان کو ہم صرف علمی اعتبار ہی سے سمجھنے پر اکتفا نہیں کریں گے بلکہ اس رکوع کے مضامین کی جو تعلیم عملی انطباق (Practicable Application) سے متعلق ہے اور ہمارے لئے اس میں جو عملی سبق ہے اس کو میں بعد ازاں ایک تقریر کی شکل میں کسی قدر وضاحت سے آپ کے سامنے رکھوں گا۔ ارشاد ہوا:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾

''یقیناً تمہارے لئے اللہ کے رسولؐ میں ایک نہایت اعلیٰ نمونہ ہے۔''

اسوہ کے لفظ کا مادہ ''اس و'' ہے۔ اُسوہ اور اِسوہ دونوں اس کے تلفظ ہیں۔ جس طرح قُدوہ اور قِدوہ دونوں ہم معنی ہیں' اسی طرح لفظ اُسوہ اور اِسوہ دونوں استعمال ہوتے ہیں' اور اس کا معنی و مفہوم ہے کسی کا اتباع کرنا' اور اس اتباع کو اپنے اوپر لازم کر لینا' خواہ اس میں کوئی تکلیف ہو خواہ مسرت۔ چنانچہ کسی کے اتباع کو اپنے اوپر مسرت و راحت اور تکلیف و مضرت دونوں کیفیات میں لازم کر لینا اسوہ ہوگا۔ اردو میں جب اس لفظ کا ترجمہ ایک لفظ میں کیا جائے گا تو ''نمونہ'' اس کے قریب ترین مفہوم کا حامل ہے' لیکن اس ترجمے سے ''اسوہ'' کا حقیقی مفہوم ادا نہیں ہوتا۔ اصل میں ''اتباعِ سنت'' کی جو اصطلاح ہمارے ہاں زیادہ معروف ہے اسی کی ایک نہایت حسین و جمیل تعبیر لفظ اسوہ میں موجود ہے۔

یہاں ''لَكُمْ'' (تمہارے لئے) عام ہے۔ گویا اس کے مخاطب صرف صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نہیں ہیں' بلکہ تا قیامِ قیامت تمام مسلمانوں کے لئے نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اور حیاتِ طیبہ ایک اسوۂ حسنہ اور کامل نمونہ ہے۔

قرآن مجید اور اُسوۂ رسولؐ میں ایک قدرِ مشترک

آگے فرمایا: ﴿لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝﴾ یہ درحقیقت ''لَكُمْ'' کا بدل آ رہا ہے — آیت کے اس ٹکڑے میں وہ دونوں مفاہیم

جمع کر دیئے گئے ہیں جو قرآن مجید کے بارے میں سورۃ البقرۃ میں دو مختلف مقامات پر آئے ہیں۔ قرآن اپنی جگہ ہر نوع بشر کے لئے ہدایت کاملہ اور ہدایت تامہ ہے۔ اس میں تا قیامِ قیامت ہر دَور میں تمام نوع انسانی کے لئے ہدایت و رہنمائی موجود ہے اور یہ ہر اعتبار سے اکمل و اتم ہے۔ چنانچہ قرآن کو ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' کہا گیا ہے (البقرۃ:۱۸۵) یہ علی الاطلاق ہے' یعنی یہ تمام انسانوں کے لئے ہدایت ہے۔ لیکن سورۃ البقرۃ کی دوسری آیت میں اس قرآن کو ''هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ'' قرار دیا گیا ہے۔ گویا اس ہدایت سے استفادہ کرنے کی ایک شرط ہے' اور وہ تقویٰ ہے۔ یعنی کچھ خدا ترسی ہو' کچھ اللہ کی طرف انابت ہو' نیکی اور بدی کا کوئی شعور بیدار ہو' انسان خیر و شر میں امتیاز کرتا ہو۔ چنانچہ تقویٰ کا اساسی سرمایہ اور بنیادی اثاثہ اگر موجود نہیں ہوگا تو انسان اس قرآن سے ہدایت حاصل نہیں کر سکے گا۔ قرآن اپنی جگہ ہدایتِ کاملہ و تامہ ہے' لیکن اس سے استفادے کے لئے جو شرط خود انسان کے باطن میں پوری ہونی چاہئے وہ شرط تقویٰ ہے' لہٰذا سورۃ البقرۃ آیت نمبر ۲ میں ارشاد ہوا: ﴿الٓمّٓ ۞ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۛ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ ۞﴾ اور آیت نمبر ۱۸۵ میں فرمایا: ﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ﴾

آپ میں سے شاید بعض حضرات کے علم میں ہو کہ سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی بدنامِ زمانہ کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' کے چودھویں باب میں قرآن مجید پر جو اعتراضات کئے تھے ان میں پہلا اعتراض یہی تھا کہ یہ عجیب کتاب ہے جو کہتی ہے کہ یہ متقیوں کے لئے ہدایت ہے۔ متقیوں کو ہدایت کی کیا ضرورت ہے؟ ہدایت کی ضرورت تو گمراہوں' فاسقوں اور فاجروں کو ہے۔ قرآن مجید کا سرسری مطالعہ کرنے والوں کو یہ اشکال پیش آ سکتا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے ذہنوں میں تقویٰ کا جو تصور ہے' وہ یہ ہے کہ انسان بہت نیک ہو' بہت خدا ترس ہو' اور وہ ہر اعتبار سے اپنے آپ کو گناہوں سے بچائے ہوئے ہو۔ یہاں تک کہ چھوٹی چھوٹی باتوں تک میں محتاط ہو۔ ایسے شخص کو ہم متقی کہتے ہیں۔ لہٰذا ان معانی میں جب لفظ تقویٰ سامنے آتا ہے تو هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ

کے بارے میں واقعتاً ذہن میں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے۔ وہ اشکال انتہائی بھونڈے طریقے پر اُس شخص نے پیش کیا۔ تو اِس کا حل یہی ہے کہ قرآن مجید درحقیقت ''ھُدًی لِّلنَّاسِ'' ہی ہے' لیکن اس سے استفادے کے لئے شرط لازم یہ ہے کہ تقویٰ کا کچھ نہ کچھ بنیادی اثاثہ موجود ہو۔ ایک شخص میں اگر نیکی اور بدی اور خیر و شر کی تمیز کی کچھ بھی پونجی باقی ہے تو گویا وہ بنیاد موجود ہے جس پر ہدایت کا دارومدار ہے۔ آج کل کی تعمیرات کی ٹیکنیک میں اسے starter کہتے ہیں ـــــ یعنی اگر آپ کو عمارت کا کالم مزید اوپر لے جانا ہے تو کچھ سریئے باہر نکلتے چھوڑ دیئے جاتے ہیں تاکہ اوپر کے کالم کو چڑھاتے وقت اس کا جوڑ اس کے ساتھ لگ جائے۔ پس جس طرح کسی عمارت کے کالم کو مزید اُوپر لے جانے کے لئے starter کا ہونا ضروری ہے' اسی طرح قرآن مجید سے استفادے کے لئے تقویٰ یعنی خیر و شر اور نیکی و بدی کی کچھ نہ کچھ تمیز انسان میں ہونی ضروری ہے۔

بعینہٖ یہی بات اسوۂ رسول ﷺ کے ضمن میں بھی کہی جا سکتی ہے۔ اس لئے کہ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پوری نوع انسانی کے لئے بھی مجسم ہدایت ہیں۔ آپؐ کے لئے قرآن مجید میں لفظ نور آیا ہے' بایں معنی کہ آپؐ نورِ ہدایت' شمع ہدایت اور سراجاً منیراً ہیں۔ اسی طرح قرآن مجید آپؐ کو رحمۃ للعالمین قرار دیتا ہے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ قرآن مجید کتابِ متلو ہے اور نبی اکرم ﷺ قرآنِ مجسم ہیں ـــــ جیسا کہ آپؐ کی وفات کے بعد چند لوگوں نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے آپؐ کی سیرت کے متعلق دریافت کیا تھا تو آپؓ نے جواب میں فرمایا تھا: کَانَ خُلُقُهُ الْقُرْآنُ ـــــ لیکن آپؐ کے اس اُسوہ' نور اور شمع ہدایت سے روشنی حاصل کرنے کے لئے بھی چند شرائط کو پورا کرنا لازم ہے۔ اگرچہ آپؐ اپنی جگہ شمع ہدایت ہیں اور جو چاہے آپؐ کے اسوۂ حسنہ سے رہنمائی حاصل کر لے' لیکن اس کے لئے چند شرائط ہیں۔ ان شرائط کو یہاں بایں الفاظ بیان کیا گیا:

﴿ لِمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾

''ہر اُس شخص کے لئے (نبی اکرم ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں اعلیٰ و ارفع نمونہ

ہے) جو اللہ اور یوم آخر کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔''

آیت کے اس حصے میں دو چیزیں جمع ہو گئی ہیں۔ ایک ایمان باللہ اور دوسرا ایمان بالآخرۃ۔ ہمارے دین کے تین بنیادی ایمانیات ہیں' جو گویا تین Pillars of Faith ہیں۔ (۱) ایمان باللہ یا توحید (۲) ایمان بالآخرہ یا معاد' اور (۳) ایمان بالرسالت۔ ایمان بالرسالت سے نبی اکرم ﷺ کی شخصیت کا تعلق ہے۔ یہ ایمانیات ثلاثہ باہم گتھے ہوئے ہیں۔ اگر کسی انسان کا اللہ پر ہی یقین نہیں یا اس میں شرک شامل ہے تو وہ نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس کو اپنے لئے نمونہ کیسے بنا لے گا! اور اگر اسے آخرت کا یقین نہیں تو پھر وہ آنحضرت ﷺ کے نقشِ قدم کی پیروی کیسے کرے گا! یہ پہلی دو چیزیں ہوں گی تو تیسری بات کا امکان پیدا ہو گا۔ یعنی وہ شخص جو اللہ سے غافل ہو یا کبھی کبھار یا اتفاقاً اللہ کا نام لینے والا ہو' اور جو اللہ سے ملاقات کی حقیقی امید دل میں نہ رکھتا ہو' اسی طرح جس شخص کو یوم آخرت اور محاسبۂ اُخروی کی کوئی توقع نہ ہو' گویا جو ان دو ایمانیات سے تہی دست ہو' اس کے لئے آنحضرت ﷺ کی سیرتِ مطہرہ اسوہ اور نمونہ نہیں بن سکتی۔ آنحضور ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کا اتباع وہی شخص کر سکے گا جو اللہ کے فضل اور اس کی عنایات کا امیدوار بھی ہو اور جس کو یہ دھڑکا بھی لگا ہوا ہو کہ آخرت ہونے والی ہے' جہاں کی کامیابی کا سارا دارومدار اسی بات پر ہو گا کہ اس دنیا کی زندگی میں اس کا طرزِ عمل اور رویہ اللہ کے رسول ﷺ سے کس درجے قریب تر رہا ہے۔ لہٰذا بات صاف کر دی گئی کہ:

﴿ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ﴾

اس پوری آیت کا مطلب یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی اس شخص کے لئے اسوۂ حسنہ ہے اور وہی اس کا اتباع کر سکے گا اور وہی آپؐ کے نقشِ قدم پر چل سکے گا جو اللہ کا طالب ہو اور جو آخرت میں سرخروئی چاہتا ہو اور جو کثرت کے ساتھ اللہ کو یاد کرنے والا ہو۔ یہاں رجاء کا جو لفظ آیا ہے وہ نہایت لطیف ہے۔ اس میں طالب

ہونے کا مفہوم بھی شامل ہے' اور اللہ سے ملاقات کا امیدوار ہونے کا مفہوم تو بالکل واضح ہے' جس کی وضاحت وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ سے مزید ہوگئی۔ یہاں امیدواری میں اللہ کی رحمت' اللہ کی شفقت' اللہ کی نظرِ عنایت کے جملہ مفاہیم شامل ہیں۔ جیسے سورۃ الکہف کی آیت ۲۸ میں فرمایا: ﴿اَلَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ بِالْغَدٰوۃِ وَالْعَشِیِّ یُرِیْدُوْنَ وَجْھَہٗ﴾ ''وہ لوگ جو پکارتے ہیں اپنے ربّ کو صبح و شام' اپنے ربّ کے چہرۂ انور کے طلبگار بن کر''۔ وہ اللہ سے محبت کرنے والے ہیں اور اس کی رضا و خوشنودی کے طالبین ہیں۔

یہاں فرمایا: ﴿لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ﴾ ''جو اللہ کی رضا کا امیدوار ہے اور جو یومِ آخرت میں سرخروئی کی توقع رکھتا ہے۔'' گویا اسے یقین ہے کہ یہ دن آ کر رہے گا اور جزا و سزا کے فیصلے ہو کر رہیں گے۔ ﴿وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا ۝﴾ ''اور وہ اللہ کو یاد رکھتا ہو کثرت کے ساتھ۔'' یعنی وہ ہر کام اور معاملے میں اللہ کے احکام اور اس کے اوامر و نواہی کا التزام و اہتمام کرتا ہو اور زبان و قلب سے بھی اللہ کو یاد کرتا ہو۔ وہ اس بات کو ہر لمحہ اور ہر لحظہ قلب و شعور میں مستحضر رکھتا ہو کہ اسے یومِ آخرت میں اللہ کی عدالت میں پیش ہو کر اپنی اس دُنیوی زندگی کا حساب دینا ہے۔ یہ تین شرطیں پوری ہوں گی تو اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر کسی درجے عمل پیرا ہونے کا امکان پیدا ہوگا۔

اسوۂ حسنہ کی پیروی کا عملی نمونہ

اب چونکہ یہاں نبی اکرم ﷺ کے اتباع کا مضمون چلا ہے تو ضرورت تھی کہ مثال پیش کر کے بتایا جائے کہ آپؐ کے اسوۂ حسنہ کا اتباع کرنے والوں کا رویہ کیا ہوتا ہے اور ان کے طرزِ عمل میں کیا فرق واقع ہوتا ہے! لیکن قرآن حکیم میں آپ کو یہ اسلوب عام ملے گا کہ استدلال کی کڑیوں کو بسا اوقات اس طرح نمایاں نہیں کیا جاتا جس طرح ہم نمایاں کرتے ہیں کہ اس بات کا نتیجہ یہ نکلا یا یہ نکلنا چاہئے۔ جیسے ہم کہیں گے کہ نبی اکرم ﷺ کے اِس اسوۂ حسنہ کی کامل مثال دیکھنی ہو تو صحابہ کرام ؓ کی زندگیوں کو دیکھو جو اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کی مکمل تصویر پیش کرتی ہیں۔ یہاں یہ بات

کہے بغیر اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ان الفاظ میں ذکر فرما دیا گیا:

﴿ وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ﴾

''اور حقیقی مؤمنوں کا حال اُس وقت یہ تھا کہ جب انہوں نے دشمنوں کے لشکروں کو دیکھا تو وہ پکار اٹھے کہ یہ وہی بات ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی۔ اور اس صورتِ حال نے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا کی کیفیت کو اور زیادہ بڑھا دیا۔''

یہ بات گویا اس اسوۂ حسنہ کی پیروی کا ایک عملی نمونہ اور مظاہرہ ہے۔

غزوۂ احزاب کے تناظر میں اصل اسوۂ رسولؐ

یہ اسوۂ حسنہ کیا ہے جس کا اس سورۃ الاحزاب میں ذکر کیا گیا ہے؟ اسے ہمیں ذرا تفصیل سے سمجھنا ہوگا۔ یوں تو نبی اکرم ﷺ کی پوری زندگی ہر مسلمان کے لئے ہر اعتبار سے ایک کامل نمونہ ہے۔ ایک باپ کے لئے آپؐ بہترین نمونہ ہیں کہ ایک باپ کو اپنی اولاد کے ساتھ کیا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہئے۔ ایک شوہر کے لئے آپؐ کامل نمونہ ہیں کہ اسے اپنے گھر میں اپنی بیوی یا بیویوں کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ ایک پڑوسی کے لئے آپؐ اُسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک مرشد و مزکّی، ہادی و داعی اور مبلغ کے لئے آپؐ اُسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک حکمران اور سربراہ ریاست کے لئے آپؐ اسوۂ کاملہ ہیں۔ ایک منصف اور قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) کے لئے آپؐ اسوۂ کاملہ ہیں۔ غرض زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس میں نبی اکرم ﷺ کا اسوۂ حسنہ اکمل و اتم نہ ہو۔

میں کئی مرتبہ سیرت کی تقاریر میں اپنے اس شدتِ تاثر کو بیان کر چکا ہوں کہ سیرتِ مطہرہ کے مطالعے سے میں مبہوت ہو جاتا ہوں اور میرے قلب پر نبی اکرم ﷺ کی شخصیت مطہرہ کا یہ گہرا تاثر ثبت ہوتا ہے کہ اس قدر جامع شخصیت تو ہمارے تصور میں بھی آنی ممکن نہیں۔ کیا زندگی کا کوئی گوشہ ایسا ہے جو اسوۂ حسنہ کے

اعتبار سے نامکمل و ناتمام اور خالی نظر آتا ہو!۔۔۔ آپ ﷺ کی حیات طیبہ ہر پہلو سے معروف ترین اور گھمبیر ترین تھی۔ ہمارا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ جو مسجد کا امام ہو وہ عموماً خطابت نہیں کرتا' خطیب علیحدہ ہونا چاہئے۔ جو خطیب صاحب ہیں وہ پانچ وقت کی نماز پڑھانے کی پابندی کیسے قبول کر لیں گے! گویا کہ امامت علیحدہ' خطابت علیحدہ۔ پھر مدرس علیحدہ۔۔۔ مزید برآں جو صاحب درس کے فرائض انجام دے رہے ہوں' عام طور پر ان سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ یہ تزکیہ و تربیت بھی کریں گے۔ اس کے لئے کہیں اور جایئے۔ یہاں سے تو علم حاصل کر لیجئے' مدرسین قال اللہ تعالیٰ اور قال رسول اللہ ﷺ پڑھا دیں گے' تزکیۂ نفس کے لئے عموماً کسی دوسرے مزکی و مرشد کی تلاش کرنی ہو گی' جن کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ مرحلہ طے کرنا ہو گا۔۔۔ پھر جو لوگ ان شعبوں سے متعلق ہیں ممکن نہیں کہ وہ آپ کو کہیں سپہ سالار بھی نظر آئیں! یا کم از کم کچھ انتظامی امور کی انجام دہی میں ہی مصروف ملیں! ایسے لوگ اگر لکھنے پڑھنے اور تدریس و تعلیم میں زندگی بھر لگے رہے یا دعوت و تبلیغ ہی میں پوری زندگی کھپا دی اور ان میدانوں میں انہوں نے کوئی قابل قدر کارنامہ انجام دیا تو عموماً ایسے لوگوں کا گھر گرہستی والا کھاتہ کورا نظر آئے گا۔ معلوم ہو گا کہ ساری عمر شادی ہی نہیں کی جب کہیں جا کر یہ کام انجام دیئے ہیں۔

جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں جو جامعیت ہے وہ پوری انسانی تاریخ حتیٰ کہ انبیاء و رُسل کی مقدس جماعت میں بھی کہیں اور نظر نہیں آئے گی۔ آپؐ مسجد نبویؐ کے پنج وقتہ امام بھی ہیں اور خطیب بھی ہیں' اصحابؓ صفہ کے لئے مدرس و معلم بھی ہیں' تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے لئے آپ مزکی و مربی بھی ہیں۔ آپؐ ہی سپہ سالار بھی ہیں۔ صلح کی گفتگو ہو رہی ہے تو آپؐ ہی کر رہے ہیں۔ باہر سے جو وفود آ رہے ہیں تو ان سے آپؐ ہی معاملہ کر رہے ہیں۔ مقدمات و تنازعات ہیں تو وہ آپؐ کی عدالت میں پیش ہو رہے ہیں۔ تصور تو کیجئے کہ کون سا میدان اور کون سا پہلو ہے جہاں یہ محسوس ہو کہ ہمیں حضور ﷺ کی زندگی میں نمونہ نہیں مل سکتا؟ حضرت مسیح علیہ السلام کی زندگی کا

جائزہ لیجئے ـــــ بغیر کسی تنقیص کے میں یہ عرض کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ مجھے اس سے بچائے کہ میں کسی نبی کی توہین کروں' لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک باپ کے لئے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں' ایک شوہر کے لئے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں۔ کسی قاضی' کسی سپہ سالار' کسی فاتح اور کسی صدر ریاست کے لئے ان کی زندگی میں کوئی نمونہ نہیں۔ آنجنابؐ ایک درویش' ایک مبلغ اور ایک مربی و مزکی کی حیثیت سے تو ایک مکمل نمونہ ہیں' لیکن زندگی کے دوسرے شعبے اور پہلو خالی نظر آ رہے ہیں۔ لہٰذا اس اعتبار سے واقعہ یہ ہے کہ میرے قلب و ذہن اور شعور و ادراک پر جس چیز کا گہرا تاثر ہے وہ آنحضورﷺ کی حیات طیبہ کی اسی جامعیت کا ہے۔ میں جب گرد و پیش کا جائزہ لیتا ہوں اور حالات کو خود اپنے اوپر وارد کرتا ہوں تو صاف نظر آتا ہے کہ ہم ایک ذمہ داری کا بھی حق ادا نہیں کر پاتے اور اسے نباہ نہیں پاتے' جبکہ وہاں کیا عالم ہے! کون سی ذمہ داری ہے جو نہیں اٹھائی ہوئی ہے اور اس کو کما حقہ پورا نہیں کیا ہے! کون سی ذمہ داری ہے جس کی ادائیگی میں کوئی کمی رہ گئی ہو! الغرض نبی اکرمﷺ کا اسوۂ حسنہ ہر اعتبار' ہر پہلو اور ہر حیثیت سے اکمل و اتم ہے ـــــ حضورﷺ کا سب سے بڑا معجزہ تو اللہ کا نازل کردہ قرآن حکیم ہے اور دوسرا عظیم معجزہ خود نبی اکرمﷺ کی اپنی ذات اور شخصیت ہے اور اس کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو یہ ہے کہ آپؐ نے اس قدر گھمبیر اور اتنی ہمہ گیر زندگی گزاری ہے کہ ہمارے ہوش اور حیطۂ خیال میں بھی نہیں آتی ـــــ یہ بھی خاصہ نبوت ہے اور یہ صلاحیتیں اور قوتیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت شدہ ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ نبی اکرمﷺ زندگی کے ہر پہلو اور ہر گوشے کے اعتبار سے ایک اسوۂ کامل ہیں۔ لیکن یہ بات غور طلب ہے کہ قرآن مجید میں جب یہ لفظ "اسوۃ حسنۃ" آیا ہے تو کس سیاق و سباق اور سلسلۂ عبارت (context) میں آیا ہے اور اس حوالے سے آپ کا اصل اور خصوصی اُسوہ کون سا ہے! ـــــ یہ اسوۂ حسنہ وہ ہے جو ہمیں غزوۂ احزاب میں نظر آتا ہے۔ وہ صبر و ثبات' اللہ کے دین کے لئے سرفروشی و جان فشانی کہ جان نثاروں کے شانہ بشانہ اور قدم بقدم ہی نہیں بلکہ ان سے بھی بڑھ کر

ہر مشقت میں آپؐ بھی شریک تھے۔ کوئی تکلیف ایسی نہ تھی جو دوسروں نے اٹھائی ہو اور آپؐ نے نہ اٹھائی ہو۔ یہ نہیں تھا کہ کہیں زرنگار خیمہ علیحدہ لگا دیا گیا ہو' جہاں قالین بچھا دیئے گئے ہوں اور وہاں حضور ﷺ آرام فرما رہے ہوں اور مورچھل جھلے جا رہے ہوں' جبکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم خندق کھودنے کے لئے کدالیں چلا رہے ہوں۔ بلکہ معاملہ یہ تھا کہ خندق کھودنے والوں میں آپ ﷺ بھی شامل ہیں۔ کدالیں چلاتے ہوئے صحابہ کرام ؓ بیک آواز کہہ رہے ہیں: اَللّٰھُمَّ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشُ الْاٰخِرَۃِ اور نبی اکرم ﷺ ان کے ساتھ آواز میں آواز ملا کر فرما رہے ہیں: فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃَ۔ یعنی سردی اور بھوک کی تکالیف اٹھانے میں آپؐ برابر کے شریک ہیں۔ اس خیال سے کہ بھوک اور نقاہت سے کہیں کمر دہری نہ ہو جائے' صحابہ کرام ؓ نے اپنے پیٹوں پر پتھر باندھ رکھے ہیں۔ ایک صحابیؓ حضور ﷺ کو اپنے پیٹ پر بندھا ہوا پتھر دکھاتے ہیں۔ اس پر سرورِ عالم محبوب ربّ العالمین' خاتم النبیین والمرسلین ﷺ اپنا کرتا اٹھاتے ہیں تو اُن صحابیؓ کو شکم مبارک پر دو پتھر بندھے نظر آتے ہیں۔ محاصرے کے دوران آپ ﷺ ہر وقت وہاں موجود رہے اور جس طرح صحابہ کرام ؓ تکان سے چور ہو کر پتھر کا تکیہ بنا کر تھوڑی دیر کے لئے آرام کی خاطر لیٹ جاتے تھے' اسی طرح حضور ﷺ بھی وہیں کھلی زمین پر کچھ دیر کے لئے پتھر پر سر رکھ کر آرام فرما لیا کرتے تھے۔ یہ نہیں تھا کہ آپ ﷺ نے استراحت کے لئے اپنے واسطے کوئی خصوصی اہتمام فرمایا ہو۔ بنی قریظہ کی غدّاری کے بعد جس خطرے میں سب مسلمانوں کے اہل وعیال مبتلا تھے' اسی سے آپؐ کے اہل بیت بھی دوچار تھے۔ اپنے لئے یا اپنے اہل وعیال کے لئے آپؐ نے حفاظت کا کوئی خصوصی انتظام نہیں کیا تھا۔

یہ ہے اصل صورت واقعہ اور صورت حال' جس میں فرمایا گیا کہ: لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ۔ اور ہم چھوٹی چھوٹی سنتوں کی پیروی کر کے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ہم اسوۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر عمل پیرا ہیں! ویسے تو ہر چھوٹی سے چھوٹی سنت بھی وقیع اور لائق اتباع ہے۔ لیکن اگر یہ چھوٹی سنتیں اس اصل اور

بڑے اسوہ کے لئے اوٹ بن جائیں تو یہ بڑے گھاٹے کا سودا ہے۔ ان چھوٹی سنتوں پر عمل کرنے کے باعث کسی کو یہ مغالطہ اور فریب ہوسکتا ہے کہ ''میں بڑا متبع سنت ہوں۔ میں نے داڑھی بھی چھوڑ رکھی ہے' لباس میں بھی میں سنت کو پیش نظر رکھتا ہوں۔ میں نے یہ بھی اہتمام کر رکھا ہے اور وہ بھی اہتمام کر رکھا ہے''۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ اسوہ بھی زندگی میں ہے یا نہیں جو سورۃ الاحزاب میں بیان ہوا ہے! دعوت و تبلیغ اور اقامت و اظہار دین الحق کے لئے سرفروشی' جاں فشانی اور عملی جدوجہد اور اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات' تکالیف اور مصائب کو برداشت کرنا ـــــ اگر زندگی میں یہ نہیں ہے تو پھر کچھ بھی نہیں ہے۔ پھر تو درحقیقت یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں آڑ بن گئی ہیں۔ اس تل کے پیچھے پہاڑ اوٹ میں آچکا ہے۔ اور ہمارا اس وقت سب سے بڑا المیہ یہی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا اصل ''اسوہ'' ہماری نگاہوں سے اوجھل ہوگیا ہے (الا ماشاء اللہ) اور وہ اسوہ یہ ہے جو سورۃ الاحزاب میں نہایت نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے اور غزوۂ احزاب کے حالات کے بیان میں قرآن حکیم اس کی طرف مسلمانوں کی نگاہوں کو خصوصی طور پر مرتکز (focus) کرتا ہے۔

امتحان و آزمائش میں صحابہ کرامؓ کا طرزِ عمل

پھر اس اسوۂ حسنہ کا جو ٹھپا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت و کردار پر لگا ہے اور اس کی جو چھاپ ان کی زندگیوں میں آئی ہے وہ یہ ہے: ﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫﴾ جیسے کوئی مشین یا پریس ہو' اس میں لوہے کے ٹکڑے یا کاغذ رکھے ہوں تو جو ڈائی یا بلاک اس میں فٹ ہے' اسی کا نقش (impression) ان پر آتا چلا جائے گا۔ اسی طرح یہ اس ''اُسوۂ حسنہ'' کا نقش ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قبول کیا ـــــ ہم چھوٹی چھوٹی سنتوں کا مجموعہ بنا کر اسے ہی کل ''اُسوہ'' سمجھ بیٹھے ہیں اور ہمارا حال (الا ماشاء اللہ) یہ ہوگیا ہے کہ مچھر چھانے جا رہے ہیں اور سموچے اونٹ نگلے جا رہے ہیں۔ یہ وہ تمثیل ہے جو علمائے یہود کے اس طرزِ عمل پر حضرت مسیح علیہ السلام نے دی تھی کہ مہماتِ دین اور

مقتضیاتِ دین کی طرف سے تو انہوں نے آنکھیں بالکل پھیر لی تھیں یا بند کر رکھی تھیں اور جزئیات وفروعات کو وہ کل دین سمجھ بیٹھے تھے اور اسی کی تدریس وتعلیم میں مصروف رہتے تھے اور اس ضمن میں ذرا سی کمی بیشی پر لوگوں کو سرزنش بھی کرتے تھے اور ان کی تکفیر بھی کرتے تھے۔ حضرت مسیحؑ کی بیان کردہ یہ تمثیل دنیا کے ہر کلاسیکل ادب میں ہمیشہ ہمیش کے لئے ضرب المثل بن گئی ہے ـــــ میں پھر عرض کر دوں کہ خدارا میری اس گفتگو کا ہرگز یہ مطلب نہ سمجھ لیجئے گا کہ میں چھوٹی چھوٹی سنتوں کی تحقیر کر رہا ہوں یا ان کی اہمیت گھٹا رہا ہوں' معاذ اللہ! نبی اکرم ﷺ کی ہر سنت' چاہے وہ کتنی ہی چھوٹی کیوں نہ ہو' واجب الاتباع ہے۔ ان سنتوں کا اہتمام والتزام اگر اس ''اُسوہ'' کے ساتھ ہو جو اِس سورۂ مبارکہ کے مطالعے کے ذریعے ہمارے سامنے آ رہا ہے تو ہونا ہے' اس کے بغیر ہو تو تا نبا ہے' جس کی سونے کے مقابلے میں کوئی قدر و قیمت نہیں۔ اس لئے کہ اگر نسبت وتناسب درست نہیں ہوگا تو صحیح نتیجہ کیسے برآمد ہوگا! پھر تو وہی طرزِ عمل وجود میں آئے گا جو میں حضرت مسیحؑ کی تمثیل کے حوالے سے عرض کر چکا ہوں۔

اس ''اُسوہ'' کی چھاپ صحابہ کرامؓ کی شخصیتوں پر جو پڑی تو کیفیت یہ ہوگئی کہ جب انہوں نے ان لشکروں کو دیکھا جو اُمڈ اُمڈ کر اِدھر سے بھی آ رہے تھے اور اُدھر سے بھی آ رہے تھے تو وہ خوفزدہ نہیں ہوئے' بلکہ وہ کہنے لگے کہ یہ حالات تو پیش آنے والے تھے' جن کا ہم سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے وعدہ کیا تھا۔ خیبر سے کیل کانٹے سے لیس یہودیوں کے لشکر بھی آ گئے۔ مکہ سے ابوسفیان ایک لشکر جرار لے کر آ گئے۔ مشرق سے غطفان کے قبائل آ گئے۔ آیت نمبر ۱۰ میں ان تمام حالات کا نقشہ کھینچا گیا ہے اور پھر آیت نمبر ۱۱ میں فرمایا گیا: ﴿هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُونَ وَزُلْزِلُوا زِلْزَالًا شَدِيدًا ۞﴾ ''یہ وہ وقت تھا جب اہل ایمان خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے''۔ یہ نہایت کڑا امتحان تھا صحابہ کرام ؓ کے صبر وثبات کا۔ یہ آزمائش تھی ان کی استقامت اور استقلال کی! سردی کا موسم تھا۔ پھر ہر چہار طرف سے حملہ آوروں کے لشکر پر لشکر جمع ہو گئے تھے جن کی مجموعی تعداد بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی اور مسلمان

خندق کے اِس پار محصور تھے۔ دوسری طرف کیفیت یہ تھی کہ برابر خبریں مل رہی تھیں کہ مدینہ کے باہر جنوب مغرب میں بنوقریظہ کا جو یہودی قبیلہ آباد تھا اور جس سے معاہدہ تھا کہ وہ مدینہ پر حملے کی صورت میں مسلمانوں کا ساتھ دیں گے' وہ ساتھ دینے کے بجائے نقضِ عہد پر تلے بیٹھے ہیں' اور کچھ پتہ نہیں کہ وہ پیچھے سے کب مدینہ پر حملہ آور ہو جائیں' جہاں نہ صرف دفاع کا کوئی انتظام نہیں تھا بلکہ مدینہ میں صرف خواتین اور بچے موجود تھے۔ ان حالات میں اہلِ ایمان کی کیفیات کیا تھیں اور ان کی زبان سے کیا الفاظ نکلے! یہ کہ:

﴿قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾

''انہوں نے کہا کہ اسی کا تو وعدہ کیا تھا اللہ نے اور اس کے رسول (ﷺ) نے' اور اللہ اور اس کے رسول نے بالکل سچ کہا تھا۔''

امتحان و آزمائش ـــــ اللہ تعالیٰ کی سنت ثابتہ

تعین کے ساتھ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ان مؤمنین صادقین کے اس قول کے وقت قرآن مجید کا کون سا مقام اور کون سی آیت ان کے سامنے ہوگی ـــــ ویسے قرآن حکیم میں یہ مضمون مختلف اسالیب سے بار بار آیا ہے کہ ہم اہل ایمان کا امتحان لیتے ہیں' ہم انہیں آزماتے ہیں' ہم ایمان کے دعوے داروں کو آزمائیں گے۔ سورۃ العنکبوت' جو مکی سورت ہے' اس کے پہلے رکوع میں یہ مضمون خوب واضح طور پر آیا ہے اور یہ رکوع ہمارے منتخب نصاب میں شامل ہے۔ فرمایا:

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۞ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۞﴾ (آیات: ۲'۳)

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے' اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم ان سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو اِن سے پہلے گزرے ہیں۔ اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور جھوٹے کون ہیں!''

پھر سورۃ البقرۃ جو مدنی سورت ہے' کی آیت ۲۱۴ میں فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ؕ مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ؕ﴾

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا' حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں' ہلا مارے گئے' حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟''

معلوم ہوا کہ قرآن حکیم کی متعدد آیات کے ذریعے آزمائش و امتحان سے گزارنے کی اس سنت ثابتہ سے اہل ایمان کو بہت پہلے آگاہ کر دیا گیا تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کو آزمائش و ابتلاء کی بھٹیوں سے گزارا جائے گا تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی جدا کر دیا جائے ـــــ البتہ میرے خیال میں هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ کے پس منظر میں سورۃ البقرۃ کی یہ آیات آتی ہیں:

﴿وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ؕ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝﴾ (آیات ۱۵۵ تا ۱۵۷)

''اور ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے کسی قدر خوف و خطر' تنگی' فاقہ کشی اور جان و مال اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر کریں اور جب کوئی مصیبت پڑے تو کہیں کہ ہم اللہ ہی کے ہیں اور اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹ کر جانا ہے' انہیں خوشخبری دے دو۔ ان پر ان کے ربّ کی طرف سے بڑی عنایات ہوں گی' اس کی رحمت ان پر سایہ کرے گی' اور ایسے ہی لوگ راست رو ہیں۔''

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غزوۂ احزاب کی کیفیات سے ان آیات کے ذریعے اہل ایمان کو پیشگی مطلع کر دیا گیا تھا۔ هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ کے پس منظر میں یہ

آیات بہت نمایاں ہیں۔ اہل ایمان کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں اور وہ شعوری طور پر جانتے بھی تھے اور منتظر بھی تھے کہ سخت سے سخت آزمائشیں' امتحانات اور ابتلاءات آنے والے ہیں۔

میں سیرتِ مطہرہ کی تقاریر میں یہ بات کئی مرتبہ عرض کر چکا ہوں کہ شخصی طور پر ''یومِ طائف'' نبی اکرم ﷺ کے لئے سب سے کٹھن اور سب سے سخت دن تھا۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے جب دریافت کیا کہ آپؐ پر یومِ اُحد سے زیادہ کوئی سخت دن گزرا ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ ''ہاں' مجھ پر جو سخت ترین دن گزرا ہے وہ یومِ طائف تھا''۔ چنانچہ شخصی اعتبار سے حضور کے لئے یوم طائف ابتلاء و آزمائش کا نقطۂ عروج (climax) ہے' جبکہ بحیثیت مجموعی صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کی جماعت کے لئے غزوۂ احزاب آزمائش کی چوٹی ہے جس کا نقشہ پچھلے رکوع میں یوں کھینچا گیا ہے کہ: هُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا غور کیجئے کہ یہاں بھی وہی انداز ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آخری امتحان یعنی حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کرنے سے متعلق وارد ہوا ہے کہ ﴿وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰاِبْرٰهِیْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۝﴾ (الصّٰفّٰت: ۱۰۴-۱۰۶) میں سمجھتا ہوں کہ ''شاباش'' کا اس سے بہتر اسلوب ممکن نہیں ہے کہ خود ممتحن پکار اٹھے کہ امتحان فی الواقع سخت تھا۔ وہی انداز اور اسلوب یہاں ہے کہ هُنَالِکَ ابْتُلِیَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِیْدًا اللہ تعالیٰ خود فرما رہا ہے کہ ہم نے اہلِ ایمان کا کٹھن امتحان لے لیا اور ان کو خوب جھنجوڑ لیا۔

جب اہل ایمان اس امتحان اور آزمائش میں ثابت قدم نکلے تو دشمنانِ دین کے جو لشکر بادلوں کی طرح اُمڈ کر آئے تھے وہ ایسے چھٹ گئے جیسے تھے ہی نہیں۔ غزوۂ احد میں تو ستر صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے تھے لیکن یہاں کھلے مقابلے کی نوبت نہیں آئی۔ البتہ ایک دو مرتبہ خندق میں کود جانے والے کفار سے کچھ مبارزتیں ہوئیں اور تیراندازی سے چند صحابہؓ شہید ہوئے جن کی تعداد چھ سات سے زیادہ نہیں۔ اس غزوے میں

باقاعدہ کھلا مقابلہ تو ہوا ہی نہیں ۔ البتہ محاصرہ بڑا شدید اور خطرہ بڑا مہیب تھا کہ محاصرے کی طوالت' دشمنانِ اسلام کے لشکر کی تعداد' پھر سردی کا عالم اور سامانِ خورد و نوش کی قلت کی وجہ سے خندق میں موجود صحابہ کرامؓ کو سخت تکالیف و مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا' جس کا نقشہ آیت نمبر ۱۰ میں بایں الفاظ کھینچا گیا ہے کہ ﴿وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ﴾ ''جب خوف کی وجہ سے آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے مُنہ کو آنے لگے۔'' تو اِن حالات میں مؤمنینِ صادقین کی دلی کیفیات اور ان کے صبر و ثبات کا نقشہ اس آیت میں ہمارے سامنے یہ آیا کہ:

﴿وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۫ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّاۤ اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا﴾ (آیت ۲۲)

''اور حقیقی اہل ایمان کا حال اُس وقت یہ تھا کہ جب انہوں نے حملہ آور لشکروں کو دیکھا تو پکار اٹھے کہ یہ وہی چیز ہے جس کا اللہ اور اس کے رسول نے ہم سے وعدہ کیا تھا' اور اللہ اور اس کے رسول کی بات بالکل سچی تھی ۔ اور اس واقعہ نے ان کے ایمان اور تسلیم و رضا کی کیفیات میں مزید اضافہ کر دیا۔''

اس کے برعکس منافقین اور وہ لوگ جو ضعفِ ایمان کا شکار تھے' ان کا کیا حال تھا؟ فوری تقابل کے لئے ان کی دلی کیفیات سے متعلق آیات بھی دیکھ لیجئے:

﴿وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗۤ اِلَّا غُرُوْرًا ۝ وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰۤاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ؕ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا ۝ وَلَوْ دُخِلَتْ عَلَيْهِمْ مِّنْ اَقْطَارِهَا ثُمَّ سُئِلُوا الْفِتْنَةَ لَاٰتَوْهَا وَمَا تَلَبَّثُوْا بِهَاۤ اِلَّا يَسِيْرًا ۝ وَلَقَدْ كَانُوْا عَاهَدُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ لَا يُوَلُّوْنَ الْاَدْبَارَ ؕ وَكَانَ عَهْدُ اللّٰهِ مَسْئُوْلًا ۝﴾ (آیات ۱۲ تا ۱۵)

''اور یاد کرو وہ وقت جب منافقین اور وہ سب لوگ جن کے دلوں میں روگ تھا' صاف صاف کہہ رہے تھے کہ اللہ اور اس کے رسول نے جو وعدے ہم سے کئے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے ۔ جب ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ اے یثرب کے لوگو! تمہارے لئے اب ٹھہرنے کا کوئی موقع نہیں ہے' پلٹ چلو۔

جب ایک فریق یہ کہہ کر نبیؐ سے رخصت طلب کر رہا تھا کہ ہمارے گھر خطرے میں ہیں' حالانکہ وہ خطرے میں نہ تھے' دراصل وہ (محاذِ جنگ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔ اگر شہر کے اطراف سے دشمن گھس آئے ہوتے اور اس وقت انہیں فتنے کی طرف دعوت دی جاتی تو یہ اس میں جا پڑتے اور مشکل ہی سے انہیں شریک فتنہ ہونے میں کوئی تامل ہوتا۔ ان لوگوں نے اس سے پہلے اللہ سے عہد کیا تھا کہ پیٹھ نہ پھیریں گے' اور اللہ سے کیے ہوئے عہد کی باز پرس تو ہونی ہی تھی''۔

اس امتحان و آزمائش کا نتیجہ یہ نکلا کہ منافقین اور مؤمنین صادقین علیحدہ علیحدہ نمایاں ہو گئے۔ غزوۂ اُحد کے موقع پر جو منافقین راستے ہی سے پلٹ گئے تھے انہوں نے عہد کیا تھا کہ اگر آئندہ آزمائش کا کوئی موقع آیا تو وہ ہرگز پیٹھ نہ پھیریں گے۔ غزوۂ خندق میں جب اُحد سے بھی بڑا خطرہ سامنے آیا تو ان منافقین کا پول کھل گیا اور واضح ہو گیا کہ یہ لوگ اپنے اس عہد میں کتنے مخلص اور سچے تھے۔

غزوۂ احزاب میں نصرتِ الٰہی کی آمد

جب امتحان مکمل ہو گیا اور مؤمنینِ صادقین اور منافقین بھی چھٹ کر نمایاں ہو گئے تو نصرتِ الٰہی آ گئی اور ایک مہینے کے محاصرے کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک سخت آندھی بھیج دی اور ایسے نادیدہ لشکر اتارے جنہوں نے دشمنوں کے کیمپ میں کھلبلی ڈال دی۔ مزید برآں اپنی غیبی تائید سے کچھ ایسے حالات پیدا فرما دیئے کہ ان حملہ آوروں کو اسی میں عافیت نظر آئی کہ اپنے ڈیرے اٹھا کر چلتے بنے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ جَآءَتْكُمْ جُنُوْدٌ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا وَّجُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ۝﴾ (آیت ۹)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' یاد کرو اللہ کے احسان کو جو (ابھی ابھی) اُس نے تم پر کیا ہے۔ جب لشکر تم پر چڑھ آئے تو ہم نے ان پر ایک سخت آندھی بھیجی اور ایسی فوجیں روانہ کیں جو تم کو نظر نہیں آتی تھیں۔ اللہ وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا جو تم

لوگ اس وقت کر رہے تھے۔''

رات کو پورا لشکر موجود تھا' صبح دیکھا تو میدان خالی پڑا تھا۔ رات کی شدید آندھی نے ان لشکروں کے خیموں کو تلپٹ کر کے رکھ دیا اور نظر نہ آنے والی فوجوں نے کھلبلی مچا دی' جس کے نتیجے میں تمام حملہ آور لشکر صبح طلوع ہونے سے پہلے اپنا بوریا بستر گول کر کے کوچ کر گئے۔ ''نظر نہ آنے والی فوجوں'' سے مراد وہ مخفی قوتیں اور اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ وہ فرشتے ہیں جو اِس کائنات کے نظام اور انسانی معاملات میں اللہ کے حکم سے کام کرتے رہتے ہیں اور انسان ان واقعات و حوادث کو صرف ان کے ظاہری اسباب پر محمول کرتا ہے۔ بہرحال اس تمام صورت حال کی غرض و غایت دراصل آزمائش و امتحان تھی' جس میں مخلص اہل ایمان پورے اترے اور انہوں نے منافقین کے قول ﴿مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اِلَّا غُرُوْرًا﴾ کے برعکس دلی یقین کے ساتھ یہ کہا کہ: ﴿هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ﴾ اس ابتلاء سے نہ وہ ہراساں اور خوف زدہ ہوئے اور نہ ہی ان کے حوصلے پست ہوئے' بلکہ ان کی کیفیات یہ تھیں کہ: ﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِيْمَانًا وَّتَسْلِيْمًا ۝﴾ یعنی اس پوری صورتِ حال نے ان کے ایمان اور ان کی تسلیم و رضا کی کیفیات کو اور زیادہ بڑھا دیا۔ اور وہ پورے قلبی اطمینان اور انبساطِ قلب کے ساتھ اپنا سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ آیت کے اس ٹکڑے میں ''زَادَ'' کا فاعل دراصل وہ پوری صورت حال ہے جو غزوۂ احزاب میں پیش آئی۔

ایمان میں کمی بیشی ـــــ امام اعظمؒ اور امام بخاریؒ کا موقف

اب دیکھئے کہ یہ آیت اس بات کے لئے بھی نص ہو گئی کہ ایمانِ حقیقی بڑھتا بھی ہے۔ یہاں کسی ابہام کے بغیر فرمایا گیا ہے کہ اس صورتِ واقعہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مؤمنین صادقین کے ایمان میں اور اضافہ ہو گیا۔ ان کی جو کیفیت تسلیم و رضا تھی' وہ بھی بڑھ گئی ـــــ اور ان کا رویہ یہ ہو گیا کہ ع ''سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے''۔ ایمان میں اضافے کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۱۷۳ میں بھی غزوۂ احد پر تبصرے

کے دوران آیا ہے کہ: ﴿اَلَّذِیْنَ قَالَ لَھُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا﴾ ''(وہ مؤمنین صادقین) جن سے لوگوں (مراد ہیں منافقین) نے کہا کہ تمہارے خلاف بڑا لشکر آیا ہے لہٰذا ان سے ڈرو' تو یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا''۔ یہاں زَادَھُمْ ایمانِ حقیقی اور کامل سپردگی میں اضافے کے لئے آیا ہے۔ لہٰذا از روئے قرآن ایمانِ حقیقی کے بڑھنے کی نصوص ہمارے سامنے آ گئیں۔ اور جو چیز بڑھ سکتی ہے' وہ گھٹ بھی سکتی ہے۔

ایمان کے بڑھنے اور گھٹنے کا موضوع ہمارے منتخب نصاب میں ایمان حقیقی کے مباحث کے سلسلے میں بڑی تفصیل سے آتا ہے۔ یہاں میں اجمالاً وضاحت پر اکتفا کروں گا۔ درحقیقت ایک قانونی ایمان ہے جو اِس دنیا میں ہمارے ایک دوسرے کو مسلمان سمجھے جانے کا سبب یا ذریعہ بنتا ہے۔ اس قانونی ایمان میں عمل سرے سے زیر بحث نہیں آتا' لہٰذا یہ قانونی ایمان نہ بڑھتا ہے' نہ گھٹتا ہے۔ اس کے بارے میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول بالکل درست ہے کہ اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ ـــــ ''ایمان قول و قرار کا نام ہے' جو نہ بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے۔'' اس ایمان کا دارومدار اقرار باللسان پر ہے اور تصدیقِ قلبی اس میں زیرِ بحث آ ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا آلہ نہیں ہے کہ کسی کے دل میں اتار کر دیکھ لیا جائے کہ ایمان حقیقی موجود ہے یا نہیں! اور کوئی جھوٹ موٹ کلمہ پڑھ رہا ہے یا سچ پڑھ رہا ہے؟ یہ قانونی ایمان کسی شخص کے اسلامی معاشرے کا فرد اور کسی اسلامی ریاست کا شہری بننے کی بنیاد بنتا ہے اور یہ ایمان نہ گھٹتا ہے اور نہ بڑھتا ہے۔ جبکہ ایک ہے ایمانِ قلبی' یعنی ''تَصْدِیْقٌ بِالْقَلْبِ'' والا ایمان' جو دل میں ہوتا ہے۔ قانون اس سے بحث نہیں کرتا' لیکن آخرت میں ساری بحث اسی سے ہوگی۔ اللہ کو کسی کا قانونی مسلمان ہونے یا نہ ہونے کی کوئی پرواہ نہیں ہے' یہ دُنیوی معاملہ ہے' دنیا میں اس بنیاد پر معاملات طے ہو چکے۔ اللہ کی نگاہ تو تمہارے دلوں پر ہے کہ یہاں ایمان و یقین ہے یا نہیں! ـــــ اس ضمن میں سورۃ الحجرات میں فرمایا کہ ﴿وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ﴾ ''ابھی ایمان تمہارے

دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے''۔ قلبی اور حقیقی ایمان کا معاملہ یہ ہے کہ وہ گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے۔ اس دل والے ایمان میں ''عمل'' ایک جزوِ لازم بن جائے گا۔ اس لئے کہ دل میں یقین ہوگا تو عمل میں اس کا ظہور لازماً ہوگا۔ اس اعتبار سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول صدفی صد درست ہے کہ اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَّعَمَلٌ یَزِیْدُ وَیَنْقُصُ۔ یعنی ایمان قول و عمل کے مجموعے کا نام ہے' یہ بڑھتا بھی ہے اور گھٹتا بھی ہے۔ یہ ضمنی بحث ﴿وَمَا زَادَهُمْ اِلَّا اِیْمَانًا وَّتَسْلِیْمًا ۞﴾ کے ضمن میں آ گئی۔ ''اور اس چیز نے نہیں بڑھایا ان میں مگر ایمان اور تسلیم کو''۔

یہاں ایمان سے مراد حقیقی ایمان ہے جو ایک قلبی کیفیت ہے اور ''تسلیم'' سے مراد ہے سپردگی و حوالگی۔ اسلام اور تسلیم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ اسلام بابِ افعال ہے اور تسلیم بابِ تفعیل ہے۔ بابِ افعال کا خاصہ ہے کہ کوئی کام ایک دم ہو جائے' لہٰذا اسلام کا مطلب ہوگا فوری طور پر خود کو کسی کی سپردگی میں دے دینا اور بابِ تفعیل کسی کام کے پے در پے اور مسلسل ہونے کی خاصیت کے اظہار کے لئے آتا ہے۔ چنانچہ تسلیم کا مفہوم ہوگا ہر دم' ہر وقت اور مسلسل اس سپردگی کی کیفیت کو قائم و برقرار رکھنا۔ جیسے ہی کسی نے اقرار کیا کہ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ وہ دفعتہً کفر کی سرحد سے اسلام کی سرحد میں آ گیا۔ اس نے ایک پالے سے دوسرے پالے میں یکایک چھلانگ لگا دی اور وہ مسلمان ہو کر مسلم معاشرے کا فرد اور ایک مسلم ریاست کا شہری بن گیا۔ اس کو ایک مسلمان کے تمام حقوق حاصل ہو گئے۔ اور یہ بالکل برابر ہوں گے' ان میں کوئی کمی بیشی اس دنیا میں نہیں ہوگی۔ اسلام کی اس کیفیت کو وثوق حاصل ہو جائے گا اور اس کے طرزِ عمل میں مسلسل اطاعت شعاری اور فرماں برداری اور سپردگی کا مظاہرہ ہوتا رہے گا تو یہ تسلیم ہے۔ یہ مصرع اسی کیفیت کی عکاسی کرتا ہے کہ ع ''سر تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے!'' اور فارسی کا یہ شعر بھی اسی کیفیت کا مصداق ہے کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاکِ تیغت
سرِ دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی!

(جاری ہے)

تنظیم اسلامی کی دعوت

مرتبہ: شاہد اسلم محمد ☆

حضرت عزیر علیہ السلام اپنے گدھے پر بیٹھے یروشلم یعنی بیت المقدس کے پاس سے گزر رہے تھے اور شہر کی بربادی دیکھی کہ ہیکل سلیمانی مکمل طور پر مسمار ہو چکا ہے اور شہر کی ایک دیوار بھی اپنی جگہ پر سلامت نہیں۔ ان کے دل میں خیال آیا کہ اللہ اس مُردہ بستی کو کیسے دوبارہ زندہ کرے گا؟ اللہ نے انہیں سو سال تک سلا دیا۔ جب اٹھایا تو اُن سے کہا کہ دیکھو تمہارا کھانا باسی نہیں ہوا اور میں تمہارا گدھا کیسے دوبارہ زندہ کرتا ہوں! بہر حال حضرت عزیر علیہ السلام اس مشاہدے کے بعد نئے عزم سے بابل گئے جہاں بنی اسرائیل غلامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے اپنی قوم کے اندر عقائد کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا' انہیں شریعت کے نفاذ کی طرف متوجہ کیا اور پچھلی تاریخ یاد دلائی۔ ربّ کائنات نے بنی اسرائیل کی زندگی کے دن پھیر دیئے اور ایرانی بادشاہ ذوالقرنین نے بابل پر ۵۸۳ قبل مسیح حملہ کر کے رومیوں کو زبردست شکست دی اور بنی اسرائیل کو' جو کہ رومیوں کے غلام تھے' اجازت دے دی کہ وہ واپس یروشلم چلے جائیں اور اپنے دین کے مطابق زندگی گزاریں۔ چنانچہ ہیکل سلیمانی دوبارہ تعمیر ہوا اور عزیر علیہ السلام ۴۵۸ ق م میں جب یروشلم آئے تو اپنی نگاہوں سے نئی دنیا آباد دیکھی۔ تب بنی اسرائیل کے دوسرے عروج کا دَور شروع ہو گیا۔

اس سے پہلے وہ ایک عروج اور ایک زوال سے گزر آئے تھے۔ پہلا عروج ۱۰۲۰ ق م تا ۹۲۶ ق م رہا۔ یہ بنی اسرائیل کا سنہری دَور شمار ہوتا ہے۔ اس میں ۱۰۲۰ ق م تا ۱۰۰۴ ق م حضرت طالوت کا دورِ حکومت ہے' ۱۰۰۴ ق م تا ۹۶۵ ق م حضرت داؤد

☆ ناظم تنظیم اسلامی حلقہ گوجرانوالہ

علیہ السلام کی خلافت کا دور ہے اور ۹۶۵ ق م تا ۹۲۶ ق م حضرت سلیمان علیہ السلام کا دورِ حکومت ہے۔ بنی اسرائیل کا پہلا زوال حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد شروع ہوا جب متحدہ ریاست دو حصوں میں بٹ گئی۔ ۷۲۱ ق م میں اشوریوں نے حملہ کر کے دولت اسرائیل کو تباہ کر دیا۔ دوسری ریاست یہودیہ پر ۵۹۸ ق م میں بخت نصر نے حملہ کر کے ہیکل سلیمانی تباہ کر دیا۔ کئی لاکھ یہودی قتل ہوئے اور کئی لاکھ کو قید کر کے بابل لے جایا گیا' جہاں حضرت عزیر علیہ السلام نے ان کے اندر نیا ایمانی جذبہ پیدا کیا اور وہ دوبارہ فلسطین آئے۔

دوسرا عروج مکابی حکومت سے شروع ہوا' جو کہ مکمل طور پر آزاد تھی اور ۶۷ ق م تک قائم رہی۔ مگر پھر اخلاقی گراوٹ اور دین کے حصے بخرے کرنے اور دنیا پرستی نے بنی اسرائیل کو دوسرے زوال سے دوچار کیا۔ لہٰذا ربّ کائنات نے سزا کے طور پر جنرل پومپی کو مسلط کیا جس نے ۶۳ ق م میں حملہ کر کے مکابی حکومت کی آزادی سلب کر لی۔ اور زوال کی انتہا اس وقت ہوئی جب ۷۰ عیسوی میں رومی فرمانروا ٹائٹس نے یروشلم کو فتح کر لیا اور ایک دفعہ پھر بربادی بنی اسرائیل کے مقدر میں آئی۔ ایک لاکھ ۲۳ ہزار قتل اور ۶۷ ہزار غلام بنے۔ تب سے ۱۹۴۷ء تک یہودی پوری دنیا میں منتشر رہے۔ پوری دنیا کے مالدار یہودیوں کی مکارانہ سازشوں کے نتیجے میں آخر کار ۱۹۴۸ء میں انگریز نے اسرائیل کے نام پر مسلمانوں کی پشت میں خنجر گھونپ دیا' اس لئے کہ مسلمان اس وقت خود محکوم تھے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث مبارکہ ہے:

((لَیَاْتِیَنَّ عَلٰی اُمَّتِیْ مَا اَتٰی عَلٰی بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ))

(سنن الترمذی)

''میری اُمت پر بھی وہی حالات واقع ہو کر رہیں گے جو کہ بنی اسرائیل پر وارد ہوئے تھے' بالکل ایسے جیسے ایک جوتی دوسرے کے مشابہ ہوتی ہے''۔

اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کی تاریخ بھی انہی ادوار سے گزرتی ہوئی آج

عروج وزوال کے درمیان ڈوب اور ابھر رہی ہے۔ ہمارا عروج سیدنا محمد ﷺ کے ساتھ شروع ہوا۔ خلافت راشدہ کا دَور اِس اُمت کا عہد زریں ٹھہرا۔ آدھی سے زیادہ دنیا پر مسلمان حکمرانی کر رہے تھے مگر اپنی باہمی رنجشوں اور لڑائیوں اور دین سے مسلسل دوری کے سبب اللہ کی طرف سے عذاب کا پہلا کوڑا برسا۔ صلیبی طوفان نے ۱۰۹۹ء میں وہ تباہی مچائی کہ یورپی مؤرخ خود کانپ اٹھتے ہیں۔ اُمت محمدؐ کا قتل عام ہوا۔ مسجد اقصیٰ عیسائیوں کے قبضے میں اٹھاسی برس رہی۔ آخر ۱۱۸۷ء میں صلاح الدین ایوبیؒ نے بیت المقدس کو آزاد کروایا اور صلیبیوں کا رخ موڑ دیا۔ پھر مشرق کی طرف سے تاتاریوں نے حملہ کیا اور ۱۲۵۸ء میں بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی' بالکل ایسے جیسے بنی اسرائیل کو بخت نصر نے تباہ کیا تھا۔

مسلمانوں کا دوسرا عروج عربوں کے ہاتھوں نہیں بلکہ عجمی (یا آخرین) کے ہاتھوں ہوا اور انہی وحشی تاتاریوں کو اللہ نے دین کی طرف پھیر دیا اور پھر انہوں نے اسلام کا جھنڈا بلند کر دیا۔ سلطنت عثمانیہ' مغل حکومتیں انہی کی یادگار ہیں۔ اور پھر زوال کا دوسرا دور یورپی اقوام کی بالادستی سے شروع ہوا۔ تقریباً تمام مسلمان ممالک انگریزوں اور فرانسیسیوں کے زیرنگیں ہو گئے۔ بعدازاں ہر ملک میں آزادی کے لئے جذبات ابھرے۔ اب الحمد للہ مسلمان ملک آزاد تو ہیں لیکن تاحال ذہنی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آج اگر ہم وہ عروج چاہتے ہیں جس پر حضرت عزیر علیہ السلام نے اپنی قوم کو پہنچایا تھا تو اس کے لئے اصلاح جڑ سے شروع کرنا ہوگی۔

بنی اسرائیل کی تباہی اور دنیا میں ذلت و رسوائی کا سب سے بڑا سبب اپنی مقدس کتاب تورات کے بعض حصوں کو ماننا اور بعض کو ترک کر دینا تھا' جس کے متعلق سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰى اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾

''کیا تم کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک کو چھوڑ دیتے ہو؟ تو کیا سزا ہے

ان کی جو تم میں سے ایسا کریں سوائے اس کے کہ دنیا میں رسوائی ہو اور وہ قیامت کے دن سخت عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے''۔

ہماری اُمت مسلمہ آج دنیا میں اسی لئے ذلت ومحتاجی کا شکار ہے کہ ہم نے بھی قرآن کریم اور نبی اکرم ﷺ کی بعض باتوں کو اپنالیا ہے اور اکثر کو پسِ پشت ڈال دیا ہے' بالکل اس نوکر یا غلام کی طرح جس کے مالک نے اسے دس کام کرنے کے لئے کہا' نوکر نے چار کو تو پورے خلوص و اخلاص اور تن دہی سے پورا کیا اور چھ کو بھول گیا۔ تو جیسے اس نوکر کا مالک اس کے چار کئے ہوئے کاموں سے خوش نہیں ہوتا ایسے ہی ربّ کائنات بھی اس طرزِ عمل سے راضی نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَافَّةً﴾ یعنی اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔

مکمل دین کیا ہے' اسے سمجھنے کے لئے ایک تین منزلہ عمارت کو ذہن نشین کرلیں۔ عمارت کا اہم ترین حصہ اس کی بنیاد ہے۔ اس بنیاد کا ایک حصہ زیرِ زمین ہوتا ہے اور ایک حصہ باہر نظر آتا ہے۔ ایسے ہی دل میں یقین اور ایمان ہے جو صرف ربّ ہی جانتا ہے کہ کس قدر مضبوط ہے۔ جو ظاہر ہے وہ کلمہ طیبہ ہے جو انسان اپنی زبان سے ادا کرتا ہے۔ جسے ''اقرار باللسان وتصدیق بالقلب'' کہتے ہیں۔ زیرِ زمین بنیاد جتنی مضبوط ہو گی عمارت بھی اتنی ہی پکی اور دیرپا ہوگی۔ یعنی اللہ اور اس کے رسولؐ اور آخرت پر یقین صرف زبانی ہی نہیں بلکہ دل کی گہرائیوں سے ہونا چاہئے۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ کے معانی اور تشریح بندۂ مؤمن کے دل وزبان اور عمل سے بھی ظاہر ہو۔ یعنی:

۱) گواہی کے پہلے حصے کا مطلب وہ یہ سمجھ لے کہ زمین و آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب کا خالق' پروردگار' مالک' بنانے اور راستہ دکھانے والا حاکم صرف اللہ ہے۔ ان میں سے کسی حیثیت میں بھی کوئی اس کا شریک نہیں۔ ﴿اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ﴾ اسی نے بنایا اور اسی کا حکم چلتا ہے۔

۲) انسان اللہ کے سوا کسی کو ولی' کارساز' حاجت روا' مشکل کشا' فریادرس' حامی و ناصر

نہ سمجھے' کیونکہ دوسروں کے پاس نہ کوئی قوت ہے نہ اقتدار۔

۳) اللہ کے سوا کوئی نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا' لہٰذا کسی کا خوف نہ کرے اور نہ کسی پر توکل کرے' کسی سے امیدیں وابستہ نہ کرے' کیونکہ تمام اختیارات کا مالک اکیلا وہی ہے۔

۴) اللہ کے سوا کسی سے دعا نہ مانگے' کسی کی پناہ نہ ڈھونڈے' کسی کو اللہ کے معاملات میں دخل دینے والا اور ایسا زور آور نہ سمجھے کہ اس کی سفارش قضائے الٰہی کو ٹال سکتی ہے۔

۵) اللہ کے سوا کسی کے آگے سر نہ جھکائے' کسی کی پرستش نہ کرے' کسی کو نذر نہ دے اور کسی کے ساتھ وہ معاملہ نہ کرے جو مشرکین اپنے معبودوں کے ساتھ کرتے ہیں' کیونکہ تنہا اللہ ہی عبادت کا مستحق ہے۔

۶) اللہ کے سوا کسی کو بادشاہ' مالک الملک' مقتدر اعلیٰ تسلیم نہ کرے' کسی کو باختیارِ خود حکم دینے اور منع کرنے کا مجاز نہ سمجھے' کسی کو مستقل بالذات شارع اور قانون ساز نہ مانے اور اُن تمام اطاعتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دے جو ایک اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے تحت اور اُس کے قانون کی پابندی میں نہ ہوں' کیونکہ اپنے ملک کا مالک اور اپنی خلق کا ایک ہی جائز حاکم اللہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو مالکیت اور حاکمیت کا حق نہیں۔ اگر یہ کچھ مان لیا ہے تو مزید لازم آتا ہے کہ انسان اپنی آزادی و خود مختاری سے دستبردار ہو جائے اور اپنے آپ کو کسی چیز کا مختار نہ سمجھے' بلکہ اپنی جان' اپنے اعضاء' اپنی ذہنی جسمانی قوتوں اور صلاحیتوں کو اللہ کی مِلک سمجھے۔ اپنی پسند کا معیار اللہ کی پسند' اپنی ناپسندیدگی کا معیار اللہ کی ناپسندیدگی کو بنائے۔

۷) اللہ کی رضا اور اس کے قرب کو اپنی تمام محنتوں' سعی و جہد کا مقصود اور اپنی پوری زندگی کا محور ٹھہرائے۔

۸) اپنے لئے اخلاق و کردار' برتاؤ' معاشرت' تمدن' معیشت اور سیاست غرض زندگی

کے ہر معاملے میں صرف اللہ کی ہدایت کو ہدایت تسلیم کرے اور ہر اُس طریقے اور ضابطے کو رد کر دے جو اللہ کے حکم کے خلاف ہو۔

وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ کے معانی اور تشریح ذہن میں یہ ہو کہ انبیاء کے سردار نبی اکرم ﷺ کی دو حیثیتیں ہیں' ایک یہ کہ آپؐ اللہ کے بندے ہیں اور دوسرے یہ کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ پہلی حیثیت کے اعتبار سے آپؐ عبدیتِ کاملہ کے مقام پر فائز ہیں اور آپؐ کی اس حیثیت کے علم اور اعتراف سے شرک کی ان تمام اقسام کا کامل سدباب ہو جاتا ہے جن میں سابقہ اُمتیں اپنے انبیاء و رُسل کے احترام اور عقیدت و محبت میں غلو کے باعث ملوث ہو گئیں اور دوسری حیثیت کے اعتبار سے آپ ﷺ کے فرقِ مبارک پر ختمِ نبوت اور ختمِ رسالت کا تاج بھی ہے اور آپ ﷺ کے دستِ مبارک میں شہنشاہِ ارض و سما کی جانب سے اتمامِ نعمت شریعت اور تکمیل دین حق کا فرمان بھی ہے۔ گویا خالق و مالک کائنات کی طرف سے زمین پر بسنے والے انسانوں کو جس آخری نبیؐ کے ذریعہ مستند ہدایت نامہ اور ضابطۂ قانون بھیجا گیا اور جس کو اس ضابطہ کے مطابق کام کر کے ایک مکمل نمونہ قائم کر دینے پر مامور کیا گیا وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ اس بات کو جان لینے کے بعد لازم ہے کہ:

۱) انسان جملہ مخلوقات میں شدید ترین محبت آنحضور ﷺ سے کرے اور آپؐ کی اطاعت اور اتباع ہی زندگی کا اصل راستہ بن جائے۔

۲) آپ ﷺ کی ہر ہدایت و تعلیم کو جو اُن سے ثابت ہو' بے چون و چرا مان لے' اور کسی حکم کی تعمیل پر آمادگی اور کسی طریقہ کی پیروی سے رک جانے کے لئے صرف اتنی بات کافی ہو کہ اس چیز کا حکم یا اس سے منع ہونا رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہے اس کے سوا کسی دوسری دلیل پر اس کی اطاعت کی بنیاد نہ ہو۔

اپنی زندگی کے ہر معاملے میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ کی سنت کو حجت' سند اور راہنمائی قرار دے۔ جو خیال یا عقیدہ یا طریقہ کتاب و سنت کے مطابق ہو اُسے اختیار کرے' جو اُس کے خلاف ہو اسے ترک کر دے' اور جو مسئلہ حل

طلب ہوا سے حل کرنے کے لئے اسی سرچشمۂ ہدایت کی طرف رجوع کرے۔

۳) تمام عصبیتیں اپنے دل سے نکال دے خواہ وہ شخصی ہوں یا خاندانی' قبائلی ہوں یا نسلی' قومی اور وطنی ہوں یا گروہی۔ کسی کی محبت یا عقیدت میں ایسا گرفتار نہ ہو کہ رسول اکرم ﷺ کے لائے ہوئے حق کی محبت پر وہ غالب آ جائے یا اس کے مدمقابل بن جائے۔

۴) نبی ﷺ کے بعد پیدا ہونے والے کسی شخص کو نہ تو کسی معنی میں نبی یا رسول سمجھے اور نہ کسی کا یہ منصب اور مرتبہ سمجھے کہ اس کے ماننے پر انسان کا مؤمن و مسلم سمجھا جانا منحصر ہے۔

۵) یہ تسلیم کیا جائے کہ آپ ﷺ نے جو نظام قائم فرمایا اور جو خلافت راشدہ کے دوران بتمام و کمال قائم رہا' وہی دینِ حق اور نظام اسلامی کی صحیح ترین اور واحد مسلمہ تعبیر ہے۔ گویا خلافت راشدہ فی الواقع نبی ﷺ کے طریقے پر خلافت تھی اور خلفائے راشدین حضراتِ ابوبکر' عمر' عثمان' علی رضی اللہ عنہم نبی اکرم ﷺ کے وہ خلفائے راشدین مہدیین ہیں جن کی سنت آنحضور ﷺ کے بعد دین میں حجت کا درجہ رکھتی ہے۔

یہ یقین رکھا جائے کہ صحابہ کرام ؓ کو جنہیں حضور ﷺ کی صحبت اور آپ کی تعلیم و تربیت سے براہِ راست فیضیاب ہونے کی سعادت نصیب ہوئی' بحیثیت جماعت پوری اُمت پر افضلیت حاصل ہے۔ حتیٰ کہ کوئی غیر صحابی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ صحابیؓ سے افضل نہیں۔ ان کی محبت اور تعظیم و توقیر حضور ﷺ کی محبت و تعظیم ہے۔ ان سے بغض و عداوت نبی اکرم ﷺ سے بغض و عداوت کا باعث ہے۔ ان کے مابین جزوی فضیلت کے بہت سے پہلو ہیں' لیکن فضیلت کلی واضح طور پر اس طرح ہے کہ تمام صحابہ ؓ میں ایک درجہ فضیلت اصحابِ رضوانؓ کو حاصل ہے' پھر ان میں اصحابِ بدرؓ اور ان میں سے بھی عشرۂ مبشرہؓ کو خصوصی فضیلت اور ان میں سب سے بڑھ کر افضلیت حاصل ہے چار خلفائے راشدینؓ کو' پھر اُن کی افضلیت خلافت کی ترتیب کے مطابق ہے۔

مزید یہ کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سب کے سب ''عدول'' ہیں۔ان کے مابین اختلافات اور جھگڑے نفسانیت کی بنا پر نہیں' بلکہ اجتہادی غلطی کی وجہ سے ہوئے۔ چنانچہ صحابہؓ کے جھگڑوں کے بارے میں محتاط روش یہ ہے کہ زبان بند رکھی جائے۔اگر بہت ضروری ہو تو ایک کو صحیح موقف پر قائم اور دوسرے کو اجتہادی غلطی کرنے والا تو کہہ سکتے ہیں لیکن کسی کو بھی طعنے دینا یا گالی نکالنا یا الزامات لگانا قطعاً جائز نہیں۔

انسان اپنے پچھلے گناہوں کی بخشش طلب کرے' چاہے جان بوجھ کر ہوئے یا ان جانے میں۔اب اگر دل میں یقین پیدا ہو گیا' یعنی بنیاد مضبوط ہو گئی' زبان سے اقرار کر لیا تو چار ستون اُٹھیں گے۔ جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ اسلام کی عمارت پانچ ستونوں پر قائم ہے: (۱) کلمہ شہادت' جس کی تشریح ہم نے اوپر پڑھ لی ہے (۲) نماز (۳) روزہ (۴) حج (۵) زکوٰۃ۔کلمہ اگر دل سے پڑھا ہے تو لازماً عمل میں تبدیلی آئے گی۔ بندۂ مؤمن جب کلمہ طیبہ کی حقیقت پا لیتا ہے تو لازماً اپنی پوری زندگی کو اللہ اور رسولؐ کے حکم کا پابند بنا لیتا ہے۔اسی کو ''اسلام'' کہتے ہیں۔یعنی سر جھکا دینا' فرمانبرداری اختیار کر لینا۔اسی کو ربّ کائنات نے فرمایا: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ اطاعت کا معنی ہے دلی محبت کے ساتھ احکامات کو ماننا اور عمل کرنا۔اس کا تیسرا نام تقویٰ ہے۔یعنی اللہ کی ناراضگی سے بچنا' ان تمام باتوں اور اعمال کو ترک کر دینا جن سے خالق کائنات ناراض ہوتا ہے' جس کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقٰتِہٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴾ (آل عمران:۱۰۲)

''اے ایمان والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے' اور تم کو ہرگز موت نہ آئے مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو''۔

اور اسی کا چوتھا نام عبادت ہے۔یعنی جہاں نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ اللہ کے حکم کے مطابق ادا کرنا ہے وہاں زندگی کے باقی تمام شعبوں کو اللہ اور رسولؐ کے حکموں کے تابع بنانا ہے۔بندۂ مؤمن کا ہر لمحہ اور ہر فعل عبادت ہے اگر قرآن و سنت کے مطابق گزارے۔تجارت' حکومت' شادی بیاہ' اٹھنا بیٹھنا غرض زندگی کا ہر پہلو عبادت بن

جاتا ہے۔لیکن اگر نماز روزہ تو اللہ کے حکم کے مطابق کرلیا اور باقی زندگی میں اپنی من مرضی کی' سیاست میں غیراللہ کی حاکمیت قبول کرلی' تجارت میں سود شامل کرلیا' رسومات ہندوانہ اختیار کرلیں تو باقی عبادات بھی مشکوک بن جاتی ہیں' اس لئے کہ بندہ (غلام) وہ ہے جو صرف اپنے آقا کا حکم مانے۔

اب اگر پوری زندگی میں اللہ کی بندگی اختیار کرلی ہے تو بندۂ مؤمن کا دوسرا فرض یہ ہے کہ وہ باقی انسانوں تک اللہ کا پیغام پہنچائے' جیسے خود مسلمان بنا ہے دوسروں کو بھی اسلام کی دعوت دے' اللہ اور رسولؐ کے احکامات کی تبلیغ کرے' امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرے' جیسے خود اللہ کے قوانین کو توڑنے سے بچتا ہے ایسے دوسروں کو نافرمانی سے منع کرے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ رَّاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (رواہ مسلم)

''تم میں سے جو کوئی بھی منکر کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے' اگر اس کی طاقت نہیں تو زبان سے (یعنی تلقین ونصیحت سے اس برائی کو روکے) اور اگر اس کی بھی طاقت نہیں تو دل سے (نہ صرف اسے برا جانے بلکہ اس برائی کا قلع قمع کرنے کی خاطر قوت فراہم کرنے کا ارادہ کرے)' اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے''۔

یعنی صاحب ایمان انسانیت پر حجت قائم کردے کہ اے لوگو! میں نے تم تک دین پہنچانے کا حق ادا کردیا ہے۔ گویا کہ وہ لوگوں پر اللہ کی طرف سے گواہ ہوگا۔ یہ اتنی اہم ذمہ داری ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام ؓ سے گواہی لی کہ کیا میں نے تم کو دین پہنچا دیا؟ تو سب نے بیک زبان اقرار کیا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپؐ نے اللہ کا پیغام ہم تک پہنچانے کا حق ادا کردیا ہے۔ تب حضور ﷺ نے اللہ کو گواہ بناتے ہوئے صحابہ کرام ؓ کو حکم دیا کہ جاؤ' جو یہاں موجود ہیں وہ ان لوگوں تک دین پہنچائیں جو یہاں موجود نہیں۔ صحابہ' تابعین اور تبع تابعین نے اس حکم کے پیش نظر اپنا گھر بار چھوڑا اور دین ہم تک پہنچا دیا۔ آج اسی

کی ذمہ داری موجودہ مسلمانوں پر ہے کہ وہ انسانیت تک دین کا ابلاغ کر دیں۔ اسی کو ''شہادت علی الناس'' کہتے ہیں۔

اللہ کی توفیق اور مدد سے یہ فریضہ ادا کرنے کے ساتھ تیسرا فرض بندۂ مؤمن پر یہ عائد ہوتا ہے کہ اس دین کو بالفعل نافذ کرنے کی جدوجہد کرے۔ دین صرف سمجھنے سمجھانے اور دعوت و تبلیغ کے لئے نہیں' بلکہ نافذ کرنے کے لئے دیا گیا ہے۔ یہ نافذ ہوگا تو دین ہے' ورنہ مذہب ہے۔ یعنی مسجدوں میں تو اللہ کی بات مانی جا رہی ہو مگر پارلیمنٹ' سینٹ' عدالتوں' بازاروں میں غیر اللہ کی بادشاہت چل رہی ہو۔ دین نام ہے مکمل نظام اور ضابطۂ حیات کا۔ ہم جان چکے ہیں کہ بنی اسرائیل کو دنیا میں ذلت و خواری اسی بنا پر ملی کہ انہوں نے دین کے حصے بخرے کر دیئے۔

آج ہمارا بھی یہی حال ہے۔ عبادات اور تبلیغ کی حد تک تو بڑی محنت ہو رہی ہے' مگر اللہ کی بادشاہت اور حاکمیت کے قیام کی جدوجہد کی اہمیت پیش نظر نہیں۔ قرآن ہمیں کہیں حکم دیتا ہے: ﴿وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ﴾ کہ اپنے ربّ کو بڑا کرو۔ یعنی اس کی بڑائی اور کبریائی دنیا سے منواؤ! کہیں بتاتا ہے: ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ﴾ دین قائم کرو' کہیں اعلان کرتا ہے: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ یعنی اللہ کے باغیوں سے جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ فتنہ (یعنی غیر اللہ کی حاکمیت) باقی نہ رہے اور دین کُل کا کُل اللہ کا بن جائے۔ کہیں نبی اکرم ﷺ کا اس دنیا میں مبعوث کئے جانے کا مشن یہی بتایا کہ اللہ کے اس دین کو باقی باطل ادیان پر غالب کرنا ہے۔

اللہ کا نظام جب تک برپا نہیں ہوگا دنیا میں مکمل اصلاح' عروج اور سربلندی ناممکن ہے۔ پھر تو قرآن صرف تلاوت کے لئے رہ جائے گا' دستورِ حیات نہیں بن سکے گا۔ نبی اکرم ﷺ کی احادیث کا درس تو ہوگا مگر قانون کا درجہ نہ پا سکیں گی۔ لہٰذا تیسرا اہم فرض اللہ کے دین کو بالفعل نافذ کرنے کی جدوجہد کرنا ہے۔

ظاہر ہے کہ ان فرائض کو ادا کرنے کے لئے کچھ چیزیں لازماً کرنی پڑیں گی:

۱) جہاد' یعنی خود اللہ کی بندگی اختیار کرنے کے لئے اپنے نفس سے کشمکش ہوگی۔

اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ۔ شیطان انسان کے اندر سرایت کر جاتا ہے۔ اس کے وسوسوں سے بچنا ہوگا اور غلط ماحول اور معاشرے سے ٹکراؤ ہوگا' تب انسان اس قابل ہوگا کہ انفرادی سطح پر اللہ کا بندہ بن سکے۔ پھر اسے دعوت کی منزل پر باطل نظریات پھیلانے والوں کے مدمقابل ثابت قدم رہنا ہوگا۔ قرآن حکیم کو اپنے اندر جذب کر کے ہر قسم کے غلط افکار کا رد کرنا ہوگا۔ پھر تیسری منزل پر یعنی دین کو قائم کرنے کے لئے باطل پرستوں سے پنجہ آزمائی کرنا پڑے گی اور اس مرحلے پر جان کا نذرانہ بھی پیش کرنا پڑے گا' اس لئے کہ اللہ کے باغی کبھی صرف دعوت و تبلیغ سے باز نہیں آتے' بلکہ ان سے بالفعل ٹکرانا پڑتا ہے' لہٰذا اس سطح پر جہاد قتال میں بدل جاتا ہے۔

۲) التزامِ جماعت۔ پہلی اور دوسری سطح پر انسان اکیلا بھی کام کر سکتا ہے' یعنی اپنا تزکیہ اور دوسروں کو دعوت اکیلا بھی دے سکتا ہے' لیکن اگر اسے اللہ کا دیا ہوا نظام برپا کرنا ہے تو اسے لازماً کسی جماعت میں شامل ہونا پڑے گا' ایسی جماعت جو فرقہ وارانہ نہ ہو بلکہ صرف اللہ کے دین کو غالب کرنے کے لئے اٹھی ہو۔ وہ اُس میں شامل ہو کر اپنی صلاحیت کفر و باطل کو مٹانے میں لگائے۔ نبی اکرم ﷺ کا حکم ہے:

((اٰمُرُکُمْ بِخَمْسٍ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ)) (رواہ احمد والترمذی)

''میں تمہیں پانچ چیزوں کا حکم دیتا ہوں: التزامِ جماعت کا' (امیر کا) حکم سننے کا اور ماننے کا' ہجرت کا اور اللہ کی راہ میں جہاد کا''۔

ہمیں وہ احادیث تو یاد ہیں جس میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسلام پانچ بنیادوں پر قائم ہے' یعنی کلمہ' نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ۔ جبکہ مندرجہ بالا حدیث مبارکہ بھی اسی زبانِ اقدس کا فرمان ہے' لہٰذا اگر دین کو نافذ کرنے کا جذبہ ہے تو اس حدیث پر عمل پیرا ہونے کے لئے لازماً کسی جماعت میں شامل ہونا چاہئے۔

۳) بیعت۔ جماعت بنانے کے مختلف طریقے ہیں۔ جیسے آج یورپ سے حاصل کردہ جمہوری طریقے انجمنیں' ادارے' ووٹ کا نظام وغیرہ ہے' مگر نبی اکرم ﷺ کی

سیرت' صحابہؓ کے عمل اور پوری اسلامی تاریخ سے جماعت بنانے کا ایک ہی طریقہ ملتا ہے اور وہ بیعت ہے۔ یعنی ایک شخص صدا لگاتا ہے کہ میں اللہ کے دین کو نافذ کرنے کا عزم کرتا ہوں۔ اور ﴿مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ﴾ کون ہے میرا مددگار اللہ کے راستے میں؟ اور دوسرے لوگ جن کے دلوں میں دین کے نفاذ کی تڑپ ہوتی ہے وہ اللہ کے لئے اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیتے ہیں۔ وہ بیعت کرنے والا اللہ سے وعدہ کرتا ہے کہ اے اللہ! میں تیرے دین کے لئے اس شخص کی بات مانوں گا۔ نبی اکرم ﷺ سے بیعت تو غیر مشروط تھی' مگر اُن کے بعد یہ بیعت دین کے دائرے کے اندر اندر ہوگی۔ یعنی اگر امیر دین کے مطابق حکم دے گا تو ساتھی اسے مانیں گے اور اس شان کے ساتھ کہ اِدھر اشارہ ملا اُدھر جان حاضر کر دی۔ اور اگر معلوم ہو جائے کہ یہ حکم دین کے بنیادی تقاضوں سے متصادم ہے تو امیر کی بات نہیں مانی جائے گی۔ بہرحال جماعت کو منظم اور مربوط بنانے کا مسنون طریقہ بیعت ہے۔

آج جب ہم اپنے حالات پر نظر دوڑاتے ہیں تو وہ انسان جس کے دل میں دین کو برپا کرنے کی خواہش ہے' سوچتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہوگا؟ کبھی وہ خیال کرتا ہے کہ جمہوری طریقے سے یعنی الیکشن کے ذریعے سے نظام بدل جائے۔ مگر کم از کم پاکستان اور دنیا کی تاریخ سے ثابت ہے کہ مکمل تبدیلی کبھی بھی الیکشن سے ممکن نہ ہوئی۔ لہٰذا وہ کون سا طریقہ ہو جس سے باطل نظام جڑ سے اکھیڑ دیا جائے اور نظام اسلام مضبوط بنیادوں پر قائم ہو جائے۔ اس کا واحد راستہ اسلامی انقلابی جدوجہد کا راستہ ہے۔ اسی سے عادلانہ' منصفانہ اور بابرکت نظام برپا ہوگا۔ اس جدوجہد کو اپنانے والے پہلے اپنی زندگیوں کو قرآن وسنت کے سانچے میں ڈھالیں۔ اپنی خواہشات' نفس' مال واولاد کی محبت' برادری کے رسوم ورواج' غرضیکہ کوئی بھی چیز اس راہ میں اُن کے پاؤں کی بیڑی نہ بن سکے۔ حق کے لئے ہر قسم کی قربانی کے لئے ہر دم تیار رہیں اور ہر مصیبت ومشکل میں صبر وتحمل سے کام لیں۔

دوسرا مرحلہ۔ ایسے باہمت افراد جو اپنی زندگیوں کو دین کے مطابق ڈھال لیں'

وہ ایک منظم جماعت کی شکل میں اپنے آپ کو منظم کریں۔ پھر یہ قافلہ نظامِ خلافت کے قیام کے لئے اجتماعی جدوجہد کرنے کے لئے کمربستہ ہو جائے اور ابتدائی مرحلے کے طور پر زبان سے نیکیوں کا حکم اور برائیوں سے روکنے کا فریضہ سرانجام دے۔ جب تک اتنی قوت فراہم نہ ہو جائے کہ باطل نظام کو چیلنج کیا جا سکے' یہ جماعت دعوت و تربیت اور تنظیم کی توسیع و استحکام کی کوششیں جاری رکھے۔ اس دوران زیادہ توجہ ساتھیوں کی اصلاح و تربیت پر رکھے اور انتخابی سیاست سے الگ تھلگ رہتے ہوئے تحریر و تقریر اور پُرامن عوامی مظاہروں کے ذریعے نہی عن المنکر باللسان کا فریضہ پورے عزم سے سرانجام دے۔ اس پورے عرصہ میں یہ جماعت کسی مذاق' طعنے اور جبر و تشدد سے بددل اور ہراساں نہ ہو' بلکہ بھرپور طور پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرے اور ہرگز کوئی جوابی کارروائی نہ کرے۔

تیسرا مرحلہ۔ جب مناسب قوت حاصل ہو جائے' یعنی پورے پاکستان میں کم از کم دو لاکھ ایسے جاں نثار جمع ہو جائیں جو اپنی ذات کی حد تک واقعتاً اللہ کے بندے بن چکے ہوں اور اللہ کے دین کے لئے جان قربان کرنے کو سعادت سمجھتے ہوں۔ وہ ان برائیوں کا قلع قمع کرنے کے لئے کمر ہمت کس لیں جن کی نشاندہی اسلام نے کی ہے۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہوگا کہ وہ حکومتِ وقت سے مطالبہ کریں کہ وہ ان برائیوں کو ختم کرے۔ اپنے مطالبے میں وزن پیدا کرنے کے لئے اور اپنی طاقت کے اظہار کے لئے وہ جلسوں' جلوسوں' مظاہروں' ناکہ بندیوں کی شکل میں تمام جدید ذرائع استعمال کریں' لیکن اس شرط کے ساتھ کہ یہ سب کچھ پُرامن ہو اور ان کی جانب سے کوئی تشدد اور توڑ پھوڑ نہ ہو۔ اس طرزِ عمل کے نتیجے میں حکومت کی طرف سے ہونے والے ظلم و تشدد اور قید و بند کو برداشت کریں' حتیٰ کہ انہیں سینوں پر گولیاں کھانے کے لئے بھی تیار رہنا ہوگا۔ واضح رہے کہ دنیا میں کوئی انقلاب خون دیئے بغیر نہیں آیا۔ اس دَور میں اس کی مثال ایران نے پیش کی کہ مکمل غیر مسلح جدوجہد کے نتیجے میں ایک جابر و ظالم شہنشاہ کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ اس آخری اقدام کے نتیجے میں دو صورتیں ممکن ہیں۔ یا تو

باطل نظام پسپائی اختیار کرے گا اور حق کے لئے راستہ چھوڑ دے گا یا پھر اس جدوجہد میں شامل افراد اللہ کی راہ میں اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر سرخرو ہو جائیں گے اور شہادت کا رتبہ پائیں گے۔ بہرحال بندۂ مؤمن کے لئے ہر دو صورتوں میں کامیابی ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَا اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ﴾ پھر اگر ظالم و باطل نظام کا تختہ الٹنے میں اللہ کامیابی عطا فرما دے تو اس کے نتیجے میں ہر قسم کے ظلم اور ناانصافی سے پاک ایک مکمل اسلامی فلاحی ریاست قائم ہو گی جس میں خلافت راشدہ کی خصوصیات کا عکس ہوگا۔

یہ وہ تاریخی حقائق ہیں جو بنی اسرائیل اور اُمت مسلمہ کے عروج و زوال کے حوالے سے سامنے آئے کہ مسلمان کے فرائض دینی کیا ہیں' فریضہ اقامت دین کیسے ممکن ہے' آج کے دور میں انقلاب کیونکر آئے گا۔

الحمدللہ تنظیم اسلامی انہی باتوں کی طرف لوگوں کو بلا رہی ہے' ان کا شعور بیدار کر رہی ہے اور دیگر دینی جماعتوں کے قائدین کو ہر سال اپنے مرکز میں دعوت دے کر افہام و تفہیم کا موقع فراہم کر رہی ہے اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی زیر قیادت گزشتہ ربع صدی سے قرآن حکیم اور سنت رسولؐ کو مرکز و محور بناتے ہوئے مذکورہ بالا انقلابی نہج پر عمل پیرا ہے۔ لہٰذا جو مسلمان بھی اپنے دینی فرائض کو سمجھ جائے' اُمت مسلمہ کی ذلت و خواری کا درد اپنے اندر محسوس کرے اسے دعوت ہے کہ اللہ کی رضا کے لئے تنظیم میں شمولیت اختیار کر کے اللہ کے دین کی سربلندی میں اپنا فریضہ ادا کرے۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ!

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات و احادیث درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

مسلمان کا طرزِ حیات (۳۶)

علامہ ابوبکر جابر الجزائری کی شہرۂ آفاق کتاب

"منہاج المسلم" کا اردو ترجمہ

مترجم : مولانا عطاء اللہ ساجد

کتاب الاخلاق

دسواں باب

سخاوت

مسلمان کے اخلاق وصفات میں سخاوت بھی شامل ہے۔ مسلمان حریص اور بخیل نہیں ہوتا' کیونکہ حرص اور بخل برے اخلاق ہیں' جو دل کی تاریکی اور نفس کی خرابی کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ مسلمان چونکہ ایمان اور عمل صالح کا حامل ہوتا ہے لہٰذا اس کا نفس پاک اور دل روشن ہوتا ہے۔ نفس کی اس پاکیزگی اور دل کی روشنی کے ساتھ حرص اور بخل نہیں پائے جاسکتے۔ اس لئے مؤمن نہ حریص ہوتا ہے نہ بخیل۔ بخل ایک ایسا قلبی مرض ہے جس میں تمام انسان مبتلا ہیں' لیکن مؤمن کو اُس کے ایمان اور نیک اعمال مثلاً نماز اور زکوٰۃ وغیرہ —— کی وجہ سے اللہ تعالیٰ اس مہلک مرض سے بچالیتا ہے اور اسے دنیا وآخرت میں فوز وفلاح کا اہل بنا دیتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۞ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۞ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۞ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۞ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۞ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۞ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۞﴾ (المعارج:۱۹-۲۵)

''انسان یقیناً تھڑدلا بنایا گیا ہے۔ جب اسے مصیبت پہنچتی ہے تو بے صبری کرتا ہے اور جب اسے بھلائی ملتی ہے تو اسے روک کر رکھتا ہے۔ مگر نماز پڑھنے والے' جو اپنی نمازوں کو پابندی سے ادا کرتے ہیں' اور جن کے مالوں میں مانگنے

والوں اور مفلسوں کے لئے مقرر حصہ ہوتا ہے۔''

دوسرے مقام پر فرمایا:

﴿خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِمْ بِهَا.....﴾ (التوبة:۱۰۳)

''ان کے مالوں سے صدقہ لیجئے' اس کے ساتھ انہیں پاک صاف کر دیجئے۔''

ایک اور مقام پر فرمایا:

﴿وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الحشر:۹)

''اور جسے نفس کی حرص اور بخل سے بچالیا گیا تو ایسے لوگ ہی کامیاب ہوں گے۔''

چونکہ اخلاقِ حسنہ سے متصف ہونے کے لئے ایک قسم کی محنت اور تربیت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے مسلمان عملی طور پر مطلوبہ اخلاق کے حصول کے لئے جدوجہد کرتا ہے' اس مقصد کے لئے وہ دل کو ایسی آیات و احادیث یاد دلاتا ہے جن میں اچھی عادات اختیار کرنے کا حکم ہے یا اس کے برعکس بری عادات سے بچنے کا حکم ہے۔ مثلاً اگر وہ اپنے دل میں سخاوت کی صفت پیدا کرنا چاہتا ہے تو وہ اس قسم کی آیات مبارکہ اور احادیثِ نبویہ کو پڑھتا اور ان میں غور و فکر کرتا ہے۔ مثلاً ارشادِ خداوندی ہے:

﴿وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَا اَخَّرْتَنِيْ اِلٰى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ﴾ (المنافقون:۱۰)

''اور جو کچھ ہم نے تمہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کو موت آ جائے تو وہ کہے اے ربّ! تو نے مجھے ایک قریب کی (تھوڑی سی) مدت تک کیوں مؤخر نہ کر دیا کہ میں صدقہ کرتا اور نیک بن جاتا۔''

نیز ارشاد ہے:

﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى ۞ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰى ۞ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ۞ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى ۞ وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى ۞ فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ۞ وَمَا يُغْنِيْ عَنْهُ مَالُهٗ اِذَا تَرَدّٰى ۞﴾ (الیل:۵-۱۱)

''تو جس نے (راہِ خدا میں) دیا اور (گناہ سے) بچا۔ اور بہترین چیز (وحیٔ الٰہی) کو سچا سمجھا' تو ہم اسے آخر کار آسانی تک لے جائیں گے۔ لیکن جس نے بخل کیا اور لاپروائی کی اور بہترین چیز کو جھوٹا سمجھا' تو ہم اسے آخر کار مشکل میں

ڈال دیں گے۔ پھر جب وہ ہلاکت تک پہنچ جائے گا تو اسے اس کا مال کوئی فائدہ نہیں دے گا۔''

ایک مقام پر ارشاد فرمایا:

﴿وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾
(الحدید: ۱۰)

''اور تم اللہ کی راہ میں کیوں خرچ نہیں کرتے؟ حالانکہ آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کی ہے۔''

نیز فرمایا:

﴿وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ:۲۷۲)

''تم جو بھی اچھی چیز خرچ کرو گے وہ تمہیں پوری پوری مل جائے گی اور تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔''

جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

((اِنَّ اللّٰهَ جَوَّادٌ يُحِبُّ الْجُوْدَ، وَيُحِبُّ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ، وَيَكْرَهُ سفسافَهَا))[1]

''اللہ تعالیٰ سخی ہے' سخاوت کو پسند کرتا ہے' وہ اچھے اخلاق کو پسند کرتا ہے اور برے اخلاق کو ناپسند کرتا ہے''۔

نیز آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((لَا حَسَدَ اِلَّا فِي اثْنَتَيْنِ: رَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ مَالًا فَسَلَّطَهُ عَلٰى هَلَكَتِهِ فِي الْحَقِّ، وَرَجُلٌ آتَاهُ اللّٰهُ الْحِكْمَةَ فَهُوَ يَقْضِيْ بِهَا وَيُعَلِّمُهَا))[2]

''حسد (یعنی رشک) دو باتوں میں ہی (جائز) ہے۔ (یعنی صرف دو آدمی قابل رشک ہیں) ایک وہ شخص جسے اللہ نے مال دیا' پھر اُسے راہِ حق میں خرچ کرنے کی توفیق دی اور ایک وہ شخص جسے اللہ نے حکمت (اور صحیح علم) سے نوازا' وہ اس کے مطابق فیصلے کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔''

۱) طبرانی' بیھقی' مستدرك حاکم ۔ زین الدین عراقی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے۔
۲) صحیح البخاری' کتاب العلم' باب الاغتباط فی العلم والحکمة

ایک بار آپ ﷺ نے صحابہ کرام ؓ سے ارشاد فرمایا:

((اَیُّکُمْ مَالُ وَارِثِهٖ اَحَبُّ اِلَیْهِ مِنْ مَّالِهٖ؟)) قَالُوْا: یَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَا مِنَّا اَحَدٌ اِلَّا مَالُهٗ اَحَبُّ اِلَیْهِ، قَالَ: ((فَاِنَّ مَالَهٗ مَا قَدَّمَ وَمَالَ وَارِثِهٖ مَا اَخَّرَ))(۱)

''تم میں سے کون ایسا شخص ہے جسے اپنے وارث کا مال اپنے مال سے زیادہ پیارا ہو؟'' صحابہ ؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم میں سے ہر کسی کو اپنا ہی مال زیادہ پیارا ہے۔ ارشاد ہوا: ''تو پھر اس کا اپنا مال تو وہ ہے جو اُس نے آگے بھیج دیا (تاکہ آخرت میں کام آئے) اور اس کے وارثوں کا مال وہ ہے جو وہ پیچھے (دنیا میں) چھوڑ گیا۔''

اور ارشاد فرمایا:

((اِتَّقُوا النَّارَ وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ))(۲)

''آگ سے بچو اگرچہ آدھی کھجور ہی دے کر بچ سکو۔''

اس کے علاوہ ارشاد ہے:

((مَا مِنْ یَوْمٍ یُصْبِحُ الْعِبَادُ فِیْهِ اِلَّا مَلَکَانِ یَنْزِلَانِ فَیَقُوْلُ اَحَدُهُمَا: اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، وَیَقُوْلُ الْآخَرُ: اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِکًا تَلَفًا))(۳)

''جب بھی کسی دن کی صبح ہوتی ہے (آسمان سے) دو فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک کہتا ہے: اے اللہ! خرچ کرنے والے کو اس کا نعم البدل عطا فرما، اور دوسرا فرشتہ کہتا ہے: اے اللہ! بخیل کو تباہی عطا فرما۔''

علاوہ ازیں ارشاد فرمایا:

((اِتَّقُوا الشُّحَّ، فَاِنَّ الشُّحَّ اَهْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ، حَمَلَهُمْ عَلٰی اَنْ سَفَکُوْا دِمَاءَهُمْ وَاسْتَحَلُّوْا مَحَارِمَهُمْ))(۴)

''حریصانہ بخل سے پرہیز کرو، کیونکہ بخل نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا۔

---

۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب ما قدم من ماله فهو له۔

۲) صحیح البخاری، کتاب الزکاة، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة۔

۳) صحیح البخاری، کتاب الزکاة، باب قول الله تعالیٰ: ﴿فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی﴾ وصحیح مسلم، کتاب الزکاة، باب بیان ان اسم الصدقة یقع علی کل نوع من المعروف۔

٤) صحیح مسلم، کتاب البر و الصلة، باب تحریم الظلم۔

اسی نے انہیں خون ریزی اور آبرو ریزی پر آمادہ کیا تھا۔''

ایک بار ایک بکری ذبح کی گئی۔ آنحضرت ﷺ نے پوچھا: ''اس کے گوشت میں سے کیا کچھ باقی ہے؟'' حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا: صرف شانہ کا گوشت بچا ہے (یعنی باقی سارا گوشت تقسیم کر دیا گیا ہے) تب آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((بَقِیَ کُلُّھَا اِلَّا کَتِفَھَا))(۱) ''شانہ کے علاوہ سارا ہی بچ گیا ہے۔''

ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ ارشاد فرماتے ہیں:

((مَنْ تَصَدَّقَ بِعَدْلِ تَمْرَةٍ مِنْ کَسْبٍ طَیِّبٍ ' وَلَا یَقْبَلُ اللّٰهُ اِلَّا الطَّیِّبَ فَاِنَّ اللّٰهَ یَتَقَبَّلُهَا بِیَمِیْنِهٖ ثُمَّ یُرَبِّیْهَا لِصَاحِبِهَا کَمَا یُرَبِّیْ اَحَدُکُمْ فَلُوَّهٗ حَتّٰی تَکُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ))(۲)

''جو شخص پاک کمائی میں سے ایک کھجور کے برابر کوئی چیز صدقہ کرے ــــ اور اللہ تعالیٰ پاک (یعنی حلال) کمائی ہی قبول فرماتے ہیں ــــ تو اللہ تعالیٰ اس صدقہ کو اپنے دائیں ہاتھ سے قبول فرماتے ہیں' پھر صدقہ دینے والے کے لئے اسے اس طرح پالتے ہیں جس طرح کوئی شخص اپنا بچھیرا پالتا ہے حتیٰ کہ وہ صدقہ پہاڑ کی طرح ہو جاتا ہے۔''

سخاوت کی عظیم مثالیں:

(۱) حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں خطیر مالی ہدیہ ارسال فرمایا جس کی مقدار ایک لاکھ اسّی ہزار درہم تھی۔ اُمّ المؤمنین رضی اللہ عنہا نے وہ تمام مال مستحقین میں تقسیم کر دیا۔ شام کو انہوں نے لونڈی سے کہا: ''کھانا لاؤ''۔ لونڈی نے کھجوریں اور زیتون کا تیل خدمت میں حاضر کر دیا۔ اور ساتھ ہی عرض کیا: آپ نے آج اتنا مال تقسیم کر دیا' لیکن ہمارے لئے ایک درہم بھی نہ رکھا جس سے ہم روزہ کھولنے کے لئے گوشت ہی خرید لیتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا: ''اگر تم اس وقت یاد دلا دیتیں تو میں یوں ہی کر لیتی''۔

۱) جامع الترمذی' کتاب صفة القیامة' باب ۳۲۔

۲) صحیح البخاری' کتاب الزکاة' باب الصدقة من کسب طیب و صحیح مسلم' کتاب الزکاة' باب قبول الصدقة من کسب طیب و تربیتها۔

(۲) روایت ہے کہ عبداللہ بن عامر اشتریؒ نے خالد بن عقبہ بن ابی معیطؒ سے ستر ہزار درہم میں ان کا وہ گھر خرید لیا جو مکہ مکرمہ کے بازار میں واقع تھا۔ رات کو عبداللہؒ کو خالد کے بچوں کے رونے کی آواز آئی۔ انہوں نے معلوم کرایا تو پتہ چلا کہ وہ اپنا گھر چھوٹنے پر افسردہ ہیں۔ عبداللہؒ نے غلام سے کہا: ''جاؤ' انہیں بتا دو کہ گھر بھی انہی کے پاس رہے اور درہم بھی انہی کے ہو گئے''۔

(۳) روایت ہے کہ جب امام شافعیؒ مرض الموت میں مبتلا تھے تو انہوں نے وصیت کی کہ مجھے فلاں شخص غسل دے۔ جب امامؒ کی وفات ہو گئی تو اس شخص کو اُس وصیت پر عمل کے لئے بلایا گیا۔ وہ آیا اور بولا: مجھے امام صاحبؒ کے حساب کتاب والی کاپی دکھاؤ۔ وہ لائی گئی تو اس میں امام شافعیؒ کے ذمہ مختلف لوگوں کا قرض درج تھا جس کی مجموعی مقدار ستر ہزار درہم بنتی تھی۔ ان صاحب نے وہ تمام تفصیل اپنے پاس نوٹ کر لی اور تمام قرض کی ادائیگی کی ذمہ داری قبول کر لی۔ پھر کہا: امام صاحبؒ کا غسل سے یہی مقصود تھا۔ یہ کہہ کر چلا گیا۔

(۴) جب آنحضرت ﷺ نے رومیوں سے جنگ کی تیاری فرمائی تو اس وقت مسلمان انتہائی تنگ دستی کا شکار تھے۔ اسی وجہ سے یہ لشکر ''جیش العسرۃ'' کے نام سے مشہور ہے۔ اس موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دس ہزار دینار نقد اور تین سو اونٹ مع سامان اور پچاس گھوڑے جہاد کے لئے پیش کئے۔ اس طرح آدھے لشکر کا خرچ اکیلے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے برداشت کیا''۔ (۱)

کتاب الاخلاق

گیارہواں باب

تواضع

مسلمان تواضع اور فروتنی اختیار کرتا ہے لیکن خودداری کو قائم رکھتا ہے۔ تواضع اس کی اعلیٰ صفات اور عمدہ اخلاق کا ایک پہلو ہوتی ہے۔ وہ تکبر سے بچتا ہے اور سمجھتا ہے کہ تکبر ایک مسلمان کے لائق نہیں۔ چنانچہ اس کی تواضع کا مقصد رفعتوں کا حصول ہوتا ہے

۱) جامع الترمذی' کتاب المناقب' باب فی مناقب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ

اور وہ تکبر سے اس لئے بچتا ہے کہ اس کے انجام کے طور پر ذلت نہ برداشت کرنی پڑے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ ہے کہ وہ تواضع اختیار کرنے والوں کو بلند کرتا ہے اور تکبر کرنے والوں کو سرنگوں کر دیا کرتا ہے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((مَا نَقَصَتْ صَدَقَةٌ مِنْ مَّالٍ ' وَمَا زَادَ اللّٰهُ عَبْدًا بِعَفْوٍ اِلَّا عِزًّا ' وَمَا تَوَاضَعَ اَحَدٌ لِلّٰهِ اِلَّا رَفَعَهُ اللّٰهُ)) (۱)

''صدقہ سے مال میں کمی نہیں آتی' اور معاف کرنے کی وجہ سے بندے کو اللہ کی طرف سے عزت ہی ملتی ہے' اور جو کوئی اللہ کے لئے تواضع اختیار کرے اللہ تعالیٰ اسے بلند کر دیتا ہے۔''

ایک اور حدیث میں ارشاد ہے:

((حَقٌّ عَلَى اللّٰهِ اَنْ لَّا يَرْتَفِعَ شَيْءٌ مِنَ الدُّنْيَا اِلَّا وَضَعَهُ)) (۲)

''دنیا کی جو چیز بھی بلند ہوتی ہے اللہ کا حق ہے کہ اسے پست کر دے''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((يُحْشَرُ الْمُتَكَبِّرُوْنَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ اَمْثَالَ الذَّرِّ فِيْ صُوَرِ الرِّجَالِ' يَغْشَاهُمُ الذُّلُّ مِنْ كُلِّ مَكَانٍ يُسَاقُوْنَ اِلٰى سِجْنٍ فِيْ جَهَنَّمَ يُقَالُ لَهُ بُوْلَسُ تَعْلُوْهُمْ نَارُ الْاَنْيَارِ' يُسْقَوْنَ مِنْ عُصَارَةِ اَهْلِ النَّارِ طِيْنَةَ الْخَبَالِ)) (۳)

''متکبر افراد قیامت کے دن چیونٹیوں جیسے بنا کر اٹھائے جائیں گے' البتہ ان کی شکل وصورت انسانی ہوگی۔ اُن پر ہر طرف سے ذلت برسے گی' انہیں ہانک کر جہنم کے اندر ایک جیل میں لے جایا جائے گا جس کا نام بولس ہے۔ ان پر آگوں کی آگ چھا جائے گی۔ انہیں پینے کو طینۃ الخبال دیا جائے گا جو جہنمیوں کے زخموں وغیرہ سے نکلنے والا مواد ہوگا۔''

مسلمان جب توجہ سے اللہ کا کلام اور اس کے رسول ﷺ کے ارشادات سنتا ہے

۱) صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ' باب استحباب العفو والتواضع۔

۲) صحیح البخاری' کتاب الجهاد' باب ناقة النبی صلی الله علیه وسلم۔

۳) جامع الترمذی' کتاب صفة القیامة' باب ٤٧۔ امام ترمذی نے اس حدیث کو حسن کہا ہے۔ ومسند احمد

تو اس میں کبھی تواضع اختیار کرنے والوں کی تعریف ہوتی ہے' کبھی تکبر کرنے والوں کی مذمت' کبھی تواضع اختیار کرنے کا حکم ہوتا ہے کبھی تکبر کی ممانعت۔ اس کے بعد یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ وہ تواضع اختیار نہ کرے' بلکہ تواضع کو اپنی پختہ عادت نہ بنا لے؟ پھر کیسے ممکن ہے کہ وہ تکبر سے پرہیز اور متکبرین سے نفرت نہ کرے؟

اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو تواضع کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

﴿وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (الشّعراء:٢١٥)

''جو لوگ آپ کی اتباع کرتے ہیں' یعنی مومن' ان سے شفقت کا سلوک کیجئے۔''

اور فرمایا:

﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا﴾ (بنی اسرائیل:٣٧)

''زمین پر اکڑ کر نہ چلو''۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے دوستوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے تواضع کو بھی ان کا وصف قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ﴾ (المائدة:٥٤)

''وہ اُن سے محبت رکھتا ہے اور وہ اس سے محبت رکھتے ہیں' مومنوں پر نرمی کرنے والے اور کافروں پر سختی کرنے والے ہوتے ہیں۔''[1]

تواضع کی صفت اختیار کرنے والوں کو آخرت میں جو انعامات حاصل ہوں گے ان کا ذکر کرتے ہوئے اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا:

﴿تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا﴾ (القصص:٨٣)

''آخرت کا یہ گھر ہم ان لوگوں کے لئے خاص کر دیں گے جو زمین میں بلندی نہیں چاہتے نہ فساد (پھیلانا) چاہتے ہیں۔''

جناب رسول اللہ ﷺ نے تواضع کا حکم دیتے ہوئے فرمایا:

---

١) اس مفہوم کو علامہ اقبال نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم　　رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

((اِنَّ اللّٰہَ اَوْحٰی اِلَیَّ اَنْ تَوَاضَعُوْا حَتّٰی لَا یَفْخَرَ اَحَدٌ عَلٰی اَحَدٍ ، وَلَا یَبْغِیْ اَحَدٌ عَلٰی اَحَدٍ))(۱)

''اللہ نے مجھ پر وحی کی ہے کہ تم سب تواضع اور فروتنی اختیار کرو، حتیٰ کہ کوئی کسی پر فخر نہ کرے اور کوئی کسی پر زیادتی نہ کرے۔''

تواضع کی ترغیب دلانے کے لئے آنحضور ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

((مَا بَعَثَ اللّٰہُ نَبِیًّا اِلَّا رَعَی الْغَنَمَ)) فَقَالَ لَہٗ اَصْحَابُہٗ : وَاَنْتَ؟ قَالَ : ((نَعَمْ ، کُنْتُ اَرْعَاھَا عَلٰی قَرَارِیْطَ لِاَھْلِ مَکَّۃَ))(۲)

''اللہ تعالیٰ نے جو بھی نبی بھیجا ہے اس نے بکریاں ضرور چرائی ہیں''۔ صحابہ (رضی اللہ عنہم) نے عرض کیا: حضور! آپ نے بھی؟'' فرمایا: ''ہاں، میں چند قیراط اُجرت کے عوض مکہ والوں کی بکریاں چرایا کرتا تھا۔''

نبی کریم ﷺ نے یہ بھی فرمایا:

((لَوْ دُعِیْتُ اِلٰی کُرَاعٍ شَاۃٍ اَوْ ذِرَاعٍ لَاَجَبْتُ ، وَلَوْ اُھْدِیَ اِلَیَّ ذِرَاعٌ اَوْ کُرَاعٌ لَقَبِلْتُ))(۳)

''اگر مجھے بکری کا ایک پایہ بھی کھانے کی دعوت دی جائے تو میں دعوت قبول کر لوں گا اور اگر مجھے بکری کا ایک پایہ بھی تحفے کے طور پر پیش کیا جائے تو میں قبول کرلوں گا۔''

آنحضرت ﷺ نے تکبر سے نفرت پیدا کرنے کے لئے ارشاد فرمایا:

((اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِاَھْلِ النَّارِ : کُلُّ عُتُلٍّ جَوَّاظٍ مُسْتَکْبِرٍ))(۴)

''کیا میں تمہیں جہنمی افراد کا پتہ نہ دوں؟ ہر تند خو، مال کا لالچی اور متکبر (جہنمی ہے)۔''

---

۱) صحیح مسلم، کتاب الجنۃ وصفۃ نعیمھا واھلھا، باب الصفات التی یعرف بھا فی الدنیا اھل الجنۃ واھل النار۔

۲) صحیح البخاری، کتاب الاجارات، باب رعی الغنم علی قراریط۔

۳) صحیح البخاری، کتاب الھبۃ، باب القلیل من الھبۃ۔

۴) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب الکبر۔ وصحیح مسلم، کتاب الجنۃ، باب جھنم اعاذنا اللہ منھا۔

نیز ارشاد فرمایا:

((ثَلاثَةٌ لَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ : شَيْخٌ زَانٍ وَمَلِكٌ كَذَّابٌ وَعَائِلٌ مُسْتَكْبِرٌ))(۱)

''تین آدمی ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کلام نہیں کرے گا' نہ انہیں پاک کرے گا نہ ان کی طرف (نظر رحمت سے) دیکھے گا: بوڑھا بدکار' جھوٹا بادشاہ اور متکبر فقیر''۔

جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

((اَلْعِزُّ اِزَارِیْ وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَاءِیْ ' فَمَنْ يُنَازِعُنِیْ فِیْ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا عَذَّبْتُهُ))(۲)

''فخر میرا تہبند ہے اور کبریائی میری چادر ہے' جو شخص مجھ سے یہ چیزیں چھیننے کی کوشش کرے گا (یعنی فخر و تکبر اختیار کرے گا) میں اسے عذاب میں مبتلا کر دوں گا''۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((بَيْنَمَا رَجُلٌ فِیْ حُلَّةٍ تُعْجِبُهُ نَفْسُهُ مُرَجِّلٌ رَاْسَهُ يَخْتَالُ فِیْ مَشْيِهِ اِذْ خَسَفَ اللّٰهُ بِهِ الْاَرْضَ فَهُوَ يَتَجَلْجَلُ فِی الْاَرْضِ اِلٰی يَوْمِ الْقِيَامَةِ))(۳)

''ایک آدمی ایک جوڑا پہنے چلا جا رہا تھا اور اپنے آپ پر بہت خوش ہو رہا تھا۔ اس نے کنگھی پٹی کی ہوئی تھی اور اکڑ اکڑ کر چل رہا تھا' اچانک اسے اللہ تعالیٰ نے زمین میں دھنسا دیا اور وہ قیامت تک زمین میں دھنستا چلا جا رہا ہے''۔

تواضع کی علامتیں

(۱) کوئی شخص جب اپنے ہم مرتبہ افراد کے ہمراہ چل رہا ہو' تو اگر وہ ان کے

---

۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان غلظ تحریم اسبال الازار والمن بالعطیة وتنفیق السلعة بالحلف وبیان الثلاثة الذین لا یکلمهم الله یوم القیامة ولا ینظر الیهم ولا یزکیهم ولهم عذاب الیم۔

۲) صحیح مسلم' کتاب البر والصلة' باب تحریم الکبر۔

۳) صحیح البخاری' کتاب الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل' (نحوه) ۔و صحیح مسلم' کتاب اللباس' باب تحریم التبختر فی المشی مع اعجابه ثیابه (نحوه)

آگے آگے چلتا ہے تو وہ متکبر ہے' اور اگر ان کے پیچھے پیچھے چلتا ہے تو متواضع ہے۔

(۲) تواضع کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ کوئی عالم یا بزرگ آ جائے تو اس کے لئے اپنی جگہ چھوڑ دے اور اسے وہاں بٹھائے' اور جب وہ بزرگ مجلس سے اٹھے تو یہ شخص اس کی جوتیاں سیدھی کرے' اور اسے الوداع کہنے کے لئے دروازے تک جائے۔

(۳) ایک عام آدمی کے استقبال کے لئے کھڑا ہو جائے' اسے خندہ پیشانی سے ملے' اس سے سوال جواب میں نرم لہجہ اختیار کرے' اس کی دعوت قبول کرے' اس کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرے اور خود کو اس سے بہتر نہ سمجھے۔ یہ بھی تواضع کی علامت ہے۔

(۴) اپنے سے کم تر یا ہم مرتبہ شخص کی ملاقات کے لئے جائے' اس کی ضرورت پوری کرنے کے لئے اس کے ساتھ چل پڑے۔ راستے میں اس کا سامان خود اٹھائے تو ایسا شخص بھی تواضع کی صفت سے موصوف ہے۔

(۵) غریبوں' مسکینوں' بیماروں اور معذوروں کے ساتھ بیٹھنے میں تکلف نہ کرے' ان کی دعوت قبول کرے' ان کے ساتھ مل کر کھانا کھالے اور راستہ میں ان کے ساتھ چلے تو ایسا شخص متواضع ہے۔

(۶) کھانے پینے میں فضول خرچی نہ کرے اور لباس میں فخر کا اظہار نہ کرے تو یہ شخص بھی تواضع سے بہرہ ور ہے۔

تواضع کی چند عظیم مثالیں

(۱) ایک رات حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے ہاں ایک مہمان آ گیا۔ آپ لکھ رہے تھے۔ اچانک چراغ ٹمٹمانے لگا اور بجھنے والا ہو گیا' مہمان نے عرض کیا: ''میں چراغ کو درست کر دوں؟'' فرمایا: ''مہمان سے خدمت لینا اچھی بات نہیں''۔ مہمان نے کہا: ''پھر میں غلام کو جگا دیتا ہوں''۔ فرمایا: ''ابھی ابھی سویا ہے' اسے نہ جگاؤ''۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خود اٹھے اور چراغ میں تیل ڈال لیا۔ مہمان نے کہا: ''امیر

المؤمنین! آپ خود اٹھ گئے؟'' آپؓ نے جواب دیا: ''میں جب اٹھا تب بھی عمر تھا' اور واپس اپنی جگہ پر آیا ہوں تب بھی عمر ہی ہوں' اس سے میری کوئی چیز کم نہیں ہوگئی اور بہتر انسان وہ ہوتا ہے جو اللہ کی نظر میں متواضع ہو''۔

(۲) ایک بار حضرت ابوہریرہ ؓ بازار سے آئے تو آپ نے ایندھن کا گٹھا اٹھا رکھا تھا۔ اس وقت آپؓ مروان کی طرف سے مدینہ کے گورنر تھے۔ اور آپؓ فرما رہے تھے: ''گورنر کے سر پر لکڑیوں کا گٹھا ہو تو اسے گزرنے کے لئے راستہ تو دے دیا کرو''۔

(۳) حضرت عمرؓ ایک بار گوشت لے کر آئے تو حالت یہ تھی کہ بائیں ہاتھ میں گوشت اٹھا رکھا تھا اور دائیں ہاتھ میں دُرّہ تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب آپ اسلامی حکومت کے سربراہ اور امیر المؤمنین تھے۔

(۴) حضرت علی ؓ نے ایک بار گوشت خریدا اور اسے کپڑے میں ڈال کر اٹھا لیا۔ عرض کیا گیا امیر المؤمنین! ہم گوشت اٹھا کر گھر تک چھوڑ آتے ہیں۔ فرمایا: ''بچوں کے باپ کا حق ہے کہ وہ (کھانے پینے کی چیزیں) اٹھا کر لے جائے''۔

(۵) حضرت انس بن مالک ؓ فرماتے ہیں: ''مدینہ کی لونڈیوں میں سے کوئی لونڈی بھی رسول اللہ ﷺ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتی آپؐ کو لے جاتی تھی''۔ (۱)

(۶) ابوسلمہؒ کہتے ہیں: میں نے حضرت ابوسعید خدری ؓ سے عرض کیا: لوگوں نے کھانے' پینے' پہننے اور سواری کرنے کی جو نئی نئی چیزیں اختیار کر لی ہیں ان کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ ؓ نے فرمایا: ''بھتیجے! اللہ کی رضا کے لئے کھاؤ' اللہ کی رضا کے لئے پیو اور اللہ کی رضا کے لئے پہنو' ان میں سے جس چیز میں بھی فخر' تکبر' ریاکاری یا شہرت کی نیت شامل ہو جائے وہ گناہ اور اسراف ہے۔ اور اپنے گھر میں وہ خدمت انجام دیا کرو جو رسول اللہ ﷺ انجام دیا کرتے تھے۔ حضور ﷺ جانور کو

---

۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب الکبر۔

(باقی صفحہ 57 پر)

''تفسیر بالرائے''

کے ضمن میں

نامور علماء محققین کا موقف

تحریر: مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن کریم کی سب سے زیادہ معتبر اور صحیح تفسیر وہی ہو سکتی ہے جو آپ ﷺ سے براہِ راست علم حاصل کرنے والے حضرات صحابۂ کرام ﷺ سے روایت کی گئی ہو۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ تفسیر قرآن کے لئے حدیث و اثر کے نام سے ہر قسم کی جعلی اور موضوع باتوں کو تسلیم کرلیا جائے۔

علامہ سیوطی نے اتقان میں حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کا قول نقل کیا ہے:

قال احمد ثلاثة كتب ليس لها اصل التفسير والملاحم والمغازى (ج ۲، ص ۵۳۸)

''تین کتابیں احادیث کی ایسی ہیں جن کی اصل نہیں: تفسیری روایت، پیش گوئیوں اور غزوات سے متعلق واقعات و اقوال''۔

پھر سیوطی نے اپنی رائے ان لفظوں میں دی ہے:

اصل المرفوع منه فى غاية القلة (ج ۲، ص ۸۲۱)

''ایسی روایات جو براہ راست حضور ﷺ سے صحت کے ساتھ منقول ہوں تفسیر کے سلسلہ میں بہت کم ہیں۔''

روایات کے بعد آثارِ صحابہ کا درجہ ہے اور اُن میں خاص طور پر حضرت ابن عباس ﷺ کے اقوال زیادہ مشہور ہیں۔ ان کے متعلق سیوطی محققین علماء کا فیصلہ نقل کرتے ہیں:

وهذه التفاسير الطوال التى اسندوها الى ابن عباس غير مرضية

ورواتها مجاهيل (ص ٥٥٣)

''یہ لمبی لمبی تفسیری روایتیں جو ابن عباسؓ کی طرف منسوب ہیں' سب غیر پسندیدہ ہیں' سند کے لحاظ سے' اور ان کے راوی و ناقل مجہول اور نامعلوم اشخاص ہیں''۔

امام شافعیؒ نے جب اقوال ابن عباسؓ پر تحقیقی اور تنقیدی نظر ڈالی تو وہ اس نتیجہ پر پہنچے:

لم يثبت عن ابن عباس في التفسير الا شبه بمائة حديث (ص ٥٥٤)

''تقریباً سو روایتوں کے سوا حضرت ابن عباس ﷺ کی طرف منسوب اقوال صحیح ثابت نہیں ہو سکے''۔

اس مسئلہ کی وضاحت میں مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے حضرت مولانا سید محمد انور صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

''احادیث کے سب سے معتبر اور صحیح مجموعے بخاری شریف میں تفسیری روایات کا حصہ دوسری قسم کی احادیث کے مقابلہ میں بہت کم ہے اور اس میں بھی امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے منقول روایات سے زیادہ قرآن کریم کی لغوی تشریح پر زیادہ توجہ دی ہے''۔

اس تشریح کے متعلق امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے شارح حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ امام نے اس تشریح میں ابوعبید معمر ابن المثنیٰ کی کتاب ''مجاز القرآن'' پر زیادہ بھروسہ کیا ہے۔ اور حضرت شاہ صاحبؒ کی تحقیق یہ تھی کہ:

لم يعرج الى النقد اصلاً

یعنی امام بخاری نے معمر کے اقوال تنقید کے بغیر اپنی کتاب میں نقل کر دیئے ہیں۔ اسی لئے ابن المثنیٰ کی کتاب میں جو نقائص پائے جاتے ہیں وہ کوتاہیاں صحیح بخاری میں کتاب التفسیر میں باقی رہ گئی ہیں۔

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے: ''بخاری میں جو تفسیری اقوال پائے جاتے ہیں' امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ محض ان کے ناقل ہیں' یہ سمجھنا غلط ہے کہ امام بخاریؒ کا اپنا فیصلہ بھی یہی ہے.....'' (حیاتِ انور' ص ۱۲۲' بحوالہ فیض الباری)

حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا یہ فیصلہ تھا کہ تفسیر قرآن کے بارے میں نہ یہ مسلک صحیح ہے کہ جب تک کسی آیت کی تفسیر کے لئے کوئی روایت نہ ہو وہ تفسیر صحیح نہیں..... اور نہ یہ آزادروی درست ہے کہ سلف صالحین کے مستند خیالات اور لغت عربی اور سباق و سیاقِ قرآنی سے بالکل بے نیاز ہو کر قرآن کریم کی من مانی تشریح کی جائے' بلکہ تفسیر کے صحیح طریقہ کی

وضاحت کرتے ہوئے شاہ صاحبؒ فرماتے تھے:

ومن حجر علی العلماء ان لا یبرزوا معانی الکتب بعد الامعان فی السباق والسیاق والنظر الی حقائق الالفاظ المراعیة لعقائد السلف

''علماء کو اس بات سے کس نے روکا ہے کہ وہ کتاب الٰہی کے مطالب بیان کریں اس طرح کہ ان کے سامنے سیاق وسباق ہو الفاظ قرآنی کے حقائق (لغوی معنی اور مرادی مفہوم) ہوں اور ساتھ ہی سلف صالحین کے مسلمہ تصورات وعقائد کی رعایت ملحوظ رہے''۔

اس کے بعد شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں:

بل ذلک حظهم من الکتاب فانهم هم الذین ینظرون فی عجائبه ویکشفون الاسناد عن وجوه دقائقه ویرفعون الحجب عن خبئات حقائقه' فهذا النوع من التفسیر بالرأی حظ اولی العلم ونصیب العلماء المستنبطین.

''بلکہ کتاب الٰہی میں علماء کا درحقیقت یہی حصہ ہے کہ وہ اس کتاب کے نئے نئے پہلوؤں پر غور کرتے ہیں اور اس کے پوشیدہ اسرار سے نقاب اٹھتے ہیں' جو باتیں چھپی ہوئی ہیں انہیں باہر لاتے ہیں۔ اگر یہی تفسیر بالرائے ہے تو اہل علم کا حقیقت میں یہی حصہ ہے اور کتاب الٰہی سے مسائل کا استخراج کرنے والے علماء کی یہی غذا ہے''۔

(بحوالہ ''محاسن موضح قرآن'' ص ۴۱۶۔۴۱۹)

بقیہ: مسلمان کا طرزِ حیات

چارہ ڈال دیتے تھے' اونٹ کا گھٹنا باندھ دیتے تھے' گھر میں جھاڑو دے لیتے تھے' بکری کا دودھ دوہ لیتے تھے' جوتا مرمت کر لیتے تھے' کپڑے کو پیوند لگا لیتے تھے' اپنے خادم کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے تھے' اگر خادم تھک جاتا تو اس کی جگہ خود آٹا پیس لیتے تھے' بازار سے سودا خرید لاتے تھے' اسے ہاتھ میں اٹھا کر یا کپڑے میں باندھ کر لے آنا اپنی شان کے منافی نہیں سمجھتے تھے۔ آپ ﷺ امیر' غریب' بڑے اور چھوٹے ہر ایک سے مصافحہ کرتے تھے' آپ ﷺ کو راستے میں جو بھی مسلمان ملتا اسے سلام کہتے' خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا' گورا ہو یا کالا' آزاد ہو یا غلام' اسے سلام کہنے میں پہل فرماتے تھے''۔

قادیانیت سے اسلام تک

قائد اعظم کے ساتھی اور مشہور صحافی
جناب زیڈ اے سلہری کی داستان زندگی کا ایک اہم باب

جناب زیڈ اے سلہری معروف بزرگ صحافی تھے۔ اسلام اور پاکستان کے ساتھ ان کی محبت والہانہ تھی۔ انہوں نے تحریک پاکستان میں بھرپور کام کیا۔ قائد اعظم کے قریبی ساتھیوں میں سے تھے۔ انہوں نے قادیانیت کی آغوش میں آنکھ کھولی۔ سن شعور کو پہنچنے پر قادیانیت کی حقیقت آشکارا ہوئی تو تائب ہو کر مشرف باسلام ہو گئے۔ دینی غیرت وحمیت کے پیش نظر مسلمان ہونے کے بعد اپنے والد کا جنازہ پڑھا نہ والدہ کا اور نہ اپنے بھائی کا' اس لئے کہ وہ قادیانی تھے۔ ڈیلی نیوز اور روزنامہ جنگ کے ساتھ وابستہ رہے۔ ان کے مضامین اسلام اور پاکستان کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی دعوت سے پُر ہوتے تھے۔ ان کے قادیانیت سے اسلام تک کے سفر کی ایمان افروز داستان خود ان کی زبانی ملاحظہ کیجئے' جو جناب عبدالمتین خالد کی تالیف ''قادیانیت سے اسلام تک'' سے ماخوذ ہے۔

میں سیالکوٹ میں ایک نچلے متوسط گھرانے میں ۶ جون ۱۹۱۳ء کو پیدا ہوا۔ سیالکوٹ میں جو سال میں نے گزارے' وہ کسی طور پر غیر معمولی نہ تھے۔ جب میری ایک بہن کی شادی ہونا قرار پائی تو میں نے لفظ ''قادیان'' سنا۔ معلوم ہوا کہ میرے والد سالانہ جلسے پر قادیان گئے تھے اور وہاں کسی صاحب سے میری بہن کی نسبت کر آئے ہیں۔ مجھے شادی کا اچھی طرح یاد نہیں' لیکن کچھ عرصے بعد میری بہن سیالکوٹ سے چلی گئیں۔ اس سے اگلا واقعہ یہ ہوا کہ ہم سب قادیان چلے آئے۔ ہوا یوں کہ والد صاحب غالباً حیدر آباد دکن جا رہے تھے اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ ہم سیالکوٹ میں رہنے کی بجائے قادیان چلے جائیں' وہاں ہماری بہن بھی ہو گی۔ چنانچہ ہم قادیان چلے آئے اور میں وہاں تعلیم الاسلام ہائی سکول کی تیسری جماعت میں داخل ہو گیا۔

اب مجھے معلوم ہوا کہ والد صاحب ''احمدی'' ہیں۔ یہی نہیں' بلکہ انہوں نے میری والدہ کے خاندان کو بھی ''احمدیت'' سے منسلک کروا دیا ہے۔ میں نے قادیان ہی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ گویا میں قریباً آٹھ سال تک قادیان میں رہا۔ میرا یہ وقت کم وبیش نیم مدہوشی میں گزرا۔ مجھے سوائے تعلیم اور کھیل کے کسی اور چیز سے دلچسپی نہ تھی۔

اب جو قادیان کی زندگی پر غور کرتا ہوں تو وہ عجب عالمِ بے خبری میں گزری معلوم ہوتی ہے۔ بیشک جیسے جیسے میری عمر بڑھتی گئی مجھے محسوس ہوتا گیا کہ قادیان کوئی معمولی قصبہ یا گاؤں نہیں۔ وہاں بعض اوقات' سالانہ جلسے کے دنوں میں' جو دسمبر کی آخری تاریخوں میں منعقد ہوتا' خاص گہما گہمی ہوتی' باہر سے ہزاروں لوگ آتے' ہم لڑکے مہمانوں کی خدمت پر بھی مامور ہوتے۔ ان دو مشاغل' تعلیم اور کھیل نے میرے ذہن میں کسی اور شوق واستغراق کے لئے جگہ نہیں چھوڑی۔ میں دوسرے لڑکوں کے ساتھ مذہبی ارکان بجالاتا' لیکن میں قادیانیت کے انوکھے مفہوم سے ناواقف رہا۔ میں نے اکثر خلیفہ محمود احمد کا خطبہ جمعہ سنا۔ ان کی باتوں سے مترشح ہوتا تھا کہ قادیانی کوئی خاص مخلوق ہیں۔ ''ہم زندہ مسلمان ہیں' غیر احمدی مسلمان مردہ ہیں'' ان کا خاص موضوع ہوتا اور کبھی قادیان سے باہر جانے کا اتفاق ہوتا تو اس نعرے کی صدائے بازگشت سنائی دیتی اور میں دوسرے مسلمانوں کو دیکھتا کہ وہ کس اعتبار سے ہم سے پیچھے ہیں۔ لیکن جہاں مذہبی طور پر مجھ میں قادیانیت کے متعلق خاص تیقّن پیدا نہ ہوا تھا' وہاں ادبی طور پر میرا ذوق پختہ ہو رہا تھا۔ مجھے انگریزی کے علاوہ اردو سے بہت شغف تھا۔ اسی دوران مجھے علامہ اقبال کے کلام سے شناسائی ہوئی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ کلامِ اقبال نے میری زندگی کی کایا کو پلٹ کر رکھ دیا۔ ان کے فلسفۂ حیات کے جس نکتے نے مجھ پر خاص اور گہرا اثر کیا' وہ یہ تھا: ع ''زیادہ راحت منزل سے ہے نشاطِ رحیل''۔

اس کے بعد میری نظروں میں منزل کی خاص وقعت نہیں رہی' لیکن یہ بعد کی پیش رفت ہے۔ قادیان میں طالب علمی کے زمانے میں اردو ادب اور کلامِ اقبال کا مجھ پر ضرور اثر تھا کہ مجھے کچھ زبان کا چسکا پڑ گیا تھا۔ کسی بات کی تو ضرور اہمیت ہوتی ہے' لیکن طرزِ ادائیگی اور اسلوبِ بیان بھی کوئی چیز ہے۔ اب اس معیار پر' جو آہستہ آہستہ' باندازِ خاموشی اور غیر محسوس طور پر ادب کا مطالعہ مجھ میں گھر کر رہا تھا' قادیانی خطبات' تحریریں' شاعری' استدلال اور بحث ومباحثہ پر پورا اُترتا نہ لگتا تھا۔ اس لئے قادیانی ماحول میرے اندر ایک ذہنی تحفظ اور قلبی رخنہ پیدا کر رہا تھا اور میں زندگی میں قادیانی موقف سے غیر جانبدار ہوتا چلا جا رہا تھا۔ لیکن یہ

ایک ذوقی اور وجدانی راہِ انحراف تھی' اس میں وہ فکری جذبۂ بغاوت نہ تھا جو بعد ازاں عمر کی زیادہ ارتقائی منزل میں متولد ہوا۔

لیکن' کیا یہ ذوقی وجدانی راہِ انحراف میرے تبدیلیٔ عقیدہ کے لئے کافی تھی؟ آبائی مذہب چھوڑنا آسان نہیں۔ خصوصاً مجھے اپنے والد سے گہرا قلبی لگاؤ تھا تو پھر میرے خیالات اتنے بنیادی طور پر کیسے بدلے؟ یہاں یہ سوال اس لئے ضروری ہے کہ میں نے جوانی کے شروع میں ہی' بلکہ لڑکپن کے ایام میں ہی' قادیانیت کو ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ گتھی یوں سلجھ سکتی ہے کہ انسان قرآن کریم کے اس نکتے پر غور کرے کہ رشد و ہدایت کا منبع صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت عطا کرتا ہے' جسے چاہے گمراہی میں پڑا رہنے دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو قلب سلیم لے کر آئے' اسے ہم سچائی کا راستہ دکھاتے ہیں۔ لیکن یہ قلب سلیم کون عطا کرتا ہے؟ یہ بھی اس کی دین ہے۔ بعد کے تجرباتِ زندگی نے مجھے اس عقیدے پر پختہ کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے کرم کے بغیر زندگی کی کسی جہت اور کسی معاملے میں بھی ہدایت نہیں حاصل ہوتی۔ سب امور کتاب میں درج ہیں' اس لئے میں تجربے کی حد تک تو یہ کہتا ہوں کہ میں ذوقی و وجدانی طور پر ایک ایسے مقامِ فہم پر پہنچا' جو قادیانیت سے ابا کرتا تھا' لیکن حقیقت یہی ہے کہ۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

قادیان میں آٹھ سال مستقل رہائش کے بعد میں لوحِ قلب کو اِس سادہ صورت میں لے کر نکل آیا' جس حالت میں اسے لے کر میں وہاں داخل ہوا تھا۔ تعلیم قادیان میں ضرور حاصل کی' لیکن قادیان کی روح سے غیر متاثر رہا۔ ع

من و تو سے پیدا' من و تو سے پاک

لیکن' نقطۂ انحراف تک پہنچنا ایک جز تھا اور جذباتی ورثے سے نجات حاصل کرنا بالکل جدا' اس کے لئے محسوس جدوجہد کی ضرورت پڑی۔ اس جدوجہد میں کئی اور عوامل شامل ہوئے' جن کا بعد میں ذکر کروں گا۔ یہ میری زندگی کا بہت صبر آزما دور تھا۔ ابھی میری عمر سترہ سال ہی تھی اور میرے دل و دماغ میں پختگی نہ آئی تھی کہ میں اپنے مذہبی عقیدے کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھ رہا تھا' میرے لئے اس کی بنیاد متزلزل ہو چکی تھی۔

یہ پانچ سال کی داستان ہے۔ ان سالوں میں میرے مذہبی خیالات کی نشوونما کے

ساتھ ان کی تطہیر وتذکیر بھی ہوئی۔ جب تک میں سکول کے زمانے میں قادیان میں رہا' میں کسی اور دنیا کو نہ جانتا تھا۔ میرے لئے ذاتی طور پر قادیان کا ماحول پرسکون تھا' مجھے تعلیم اور کھیل کے سوا کسی اور چیز سے غرض نہ تھی' لیکن کبھی کبھی میرے کان میں عجیب وغریب افواہیں پڑتیں۔ عبدالرحمٰن مصری کا قصہ سننے میں آیا' وہ غالباً مدرسہ احمدیہ کے پرنسپل تھے' انہیں نکال دیا گیا۔ اسی طرح فخر الدین کتب فروش اور مستری عبدالکریم کے نام سننے میں آئے۔ پس منظر میں کچھ جنسی سکینڈل منڈلاتے تھے۔ بعض وقت دیواروں پر فحش زبان میں پوسٹر چسپاں نظر آتے تھے۔ زیادہ تر خلیفہ بشیر الدین محمود کی ذات الزامات کا مرکز تھی' لیکن میں نے کبھی ان معاملات میں دلچسپی نہیں لی۔ سزائیں یقیناً سنگین ہوں گی' کیونکہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ کئی لوگوں نے قادیانی فرقے کو چھوڑ کر لاہوری جماعت سے وابستگی اختیار کر لی ہے۔ ان لوگوں میں ان کے خلیفہ اوّل حکیم نور الدین کے لڑکے مولوی عبدالمنان بھی شامل ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ بھی انہی حالات میں ربوہ سے علیحدہ ہوئے جن حالات نے مولوی محمد علی کو ۱۹۱۴ء میں قادیان چھوڑ کر لاہور کی انجمن احمدیہ کا سنگ بنیاد رکھنے پر مجبور کیا تھا' یعنی وہ بھی قادیانی فرقے کے تیسرے خلیفہ مرزا ناصر احمد کے مقابل خلیفہ محمود احمد کے جانشین بننے کے دعوے دار تھے اور کہتے تھے کہ اس جماعت کے کافی لوگ ان کے حق میں تھے۔ بہرحال جو لوگ قادیان یا ربوہ چھوڑ کر لاہوری جماعت سے وابستہ ہوئے' ان کے محرکات ذاتی تھے' عقیدتاً وہ بھی مرزا غلام احمد قادیانی کے دعاوی کو صحیح مانتے تھے۔ اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ قومی اسمبلی نے احمدیت کو خارج از اسلام قرار دینے کے ضمن میں قادیانی اور لاہوری فرقوں کے درمیان تخصیص کو ناقابل اعتناء قرار دینے میں بالکل ٹھیک فیصلہ کیا۔

لیکن' ان واقعات کا میرے تشکیل جذبات کے عمل میں کوئی دخل نہیں۔ جس چیز نے میری آنکھیں کھولیں' وہ بالکل مختلف ہے۔ پہلے تو جیسا میں نے کہا' میں وجدانی اور ذوقی لحاظ سے اپنے آپ کو قادیانی اندازِ استدلال سے غیر متاثر پاتا تھا۔ مجھے ان کی تحریر وتقریر میں کوئی جاذبیت اور کشش محسوس نہ ہوتی تھی' لیکن' چونکہ میں ابھی بہت نوعمر تھا اور میں نے قادیانیت کے بنیادی دعاوی کو تجزیئے کی روشنی میں نہ دیکھا تھا' اس لئے میں ایک قسم کی غیر مرئی غیر جانبداریت کے سوا اور کوئی طرزِ عمل اختیار نہ کر سکتا تھا۔ چونکہ' ہر طرف قادیانی ہی قادیانی تھے' میں ان کے طور طریق میں کوئی نمایاں پہلو نہ دیکھتا تھا' لیکن جب میں شملہ اور دہلی آیا' تو وہاں کی قادیانی جماعت مجھے ایک نئی اور ممتاز صورت میں نظر آئی۔ اس کا امتیاز یہ تھا کہ مسلمانوں

کے درمیان رہ کر بھی اس نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائی ہوئی تھی۔

اب میں نے دیکھا کہ قادیانی نہ صرف مسلمانوں سے مذہبی و جماعتی طور پر الگ تھلگ تھے' بلکہ وہ سیاسی طور پر بھی مسلمانوں کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہ رکھتے تھے۔ ان کا اندازِ عمل کچھ ایسا تھا کہ گویا مسلمانوں اور دوسروں کے درمیان ان کی کوئی غیر جانبدارسی پوزیشن ہے۔ بالفاظ دیگر' ان کی حیثیت مسلمانوں کے جسد قومی کے ایک جزو لاینفک کی نہ تھی کہ ان کا مرنا اور جینا ان کے ساتھ مقدر ہو۔

قادیانی جماعت مسلمانوں کے بحران سے کوئی سروکار رکھتی معلوم نہ ہوتی تھی' بلکہ میں قادیانی زعماء سے یہ سن کر ہکا بکا رہ جاتا تھا اور یہ الفاظ میں نے خود خلیفہ بشیر الدین محمود کی زبان سے بھی سنے کہ ''انگریز احمدیوں کو قابل اعتماد سمجھتے ہیں اور ملازمتوں میں دوسرے مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہیں''۔ شاید اسی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے حکومت برطانیہ نے چوہدری ظفر اللہ خان قادیانی کو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن بنایا تھا۔ ان کی تقرری پر خلیفہ صاحب نے کہا تھا: ''لوگ متعجب ہیں کہ ایک احمدی کو اِس اعلیٰ عہدے کے لئے کیوں منتخب کیا گیا' آخر احمدیوں کو بھی تو اُن کا حصہ ملنا ہے' خواہ وہ کتنا ہی قلیل کیوں نہ ہو۔ حصہ بخشی اکثریت کے بجائے اقلیت سے کیوں شروع نہیں ہو سکتی؟'' میں نے دیکھا قادیانی' حکومت کی ملازمتوں کو حاصل کرنے کی خاص کوشش کرتے تھے اور ظفر اللہ خاں کے زمانۂ اقتدار میں انہیں نوکریاں ملنے میں سہولتیں بھی حاصل ہو گئی تھیں۔ وہ سرکاری افسر ہونے کو اس سیاسی طاقت کے حصول سے تعبیر کرتے' جن کا ان کے ساتھ ''الٰہی'' وعدہ کیا گیا ہے۔ ظفر اللہ خان قادیانی نے اپنی پوزیشن کا ناجائز فائدہ اٹھا کر کئی نوجوانوں کو قادیانی بھی بنایا۔ جب کوئی پڑھا لکھا اُن کے پاس سفارش کے لئے جاتا تو اس پر تبلیغ شروع کر دیتے۔ جب لوگوں نے یہ دیکھا کہ حصول ملازمت کا طریقہ ہی یہ رہ گیا ہے' تو بعض لوگ جاتے ہی احمدیت میں اپنی دلچسپی کا اظہار شروع کر دیتے۔ شملہ میں ظفر اللہ قادیانی کی مشہور سرکاری کوٹھی ریٹریٹ میں ہوتی تھی جو امیدوارانِ ملازمت کے لئے سنہری موقع مہیا کرتی۔ وہاں ظفر اللہ خاں جس نئے چہرے کو دیکھتے' اس پر مہربان ہو جاتے۔ ان باتوں سے مجھے یقین ہو گیا تھا کہ قادیانیوں کو برصغیر کی آزادی سے کوئی رغبت نہیں۔ اگر وہ مسلمانوں سے ہمدردی جتاتے ہیں تو محض ان میں اپنا اثر و رسوخ پھیلانے کو۔ جدوجہد کشمیر میں حصہ لیا تو اس تحریک کی لیڈر شپ پر اجارہ داری جمانے کے لئے۔ لیکن اصلاً وہ ٹھیٹھ مسلم مفاد سے بے اعتنائی برتتے اور اس بنیادی

رجحان کا بھرم تحریک پاکستان کے دوران کھل گیا۔ وہ برصغیر کی آزادی کے تو قائل نہ تھے لیکن مسلمانوں کے حق خودارادیت کے مخالف نکلے۔ چنانچہ انہوں نے' جہاں مسلمانوں کی جنگ آزادی سے پہلوتہی اختیار کی تھی' وہاں مسلم لیگ کی قیادت سے بھی قطعی تجارتی طرزِ عمل اختیار کیا۔ مرزا محمود احمد قادیانی خلیفہ نے قائداعظم کو لکھا کہ ''ان کی جماعت بہت اثر ورسوخ کی مالک ہے اور اس کی طاقت روز افزوں ترقی پر ہے۔ اگر مسلم لیگ اس کے تعاون کی خواہش مند ہے تو اس سے شرکت عمل کی شرطیں طے کرے' ورنہ وہ کانگریس کا ساتھ دے گی''۔ اس سے ظاہر ہے کہ وہ مسلمانوں کے مفاد کو اپنا مفاد نہ سمجھتے تھے' تاوقتیکہ ان سے کوئی عہد معاہدہ نہ ہو جائے۔ میں نے مسلمانوں کے معاملات سے قادیانی غیر جانبداری کی ذہنیت کا مظاہرہ پاکستان بننے کے بعد بھی دیکھا۔ لیکن قادیانیت کی جس خصوصیت نے مسلمانوں میں خلفشار پیدا کیا' وہ یہ تھی کہ اسے حقیقی اسلام کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ گو میں نے اُس وقت مذہبی استدلال نہیں کیا' لیکن یہ امر مجھ پر بالکل صاف ہو گیا تھا کہ اگر مجھے مسلمانوں کے امور سے تعلق منظور ہے تو میں قادیانی جماعت کا فرد نہیں رہ سکتا' مجھے ان سے آزاد پوزیشن اختیار کرنی پڑے گی۔ مجھے مداہنت سے طبعی نفرت ہے اور میں جب اس دو ٹوک نتیجے پر پہنچا تو میں نے اپنے گھر والوں اور دوستوں سے اس کا برملا ذکر کیا۔

اب قادیانیوں نے ایک صنعت کو بہت پروان چڑھایا ہوا ہے اور وہ ہے تاویل کی صنعت۔ ان کی تاویل تراشی پر علامہ اقبال کا یہ شعر صادق آتا ہے۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر
تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند

یہ اسی تاویل کا کرشمہ ہے کہ قادیانیوں نے حکومت انگلشیہ کو' نعوذ باللہ' حاکم برحق کا درجہ دیا۔ گویا کرشمہ انہوں نے تاویل کے ساتھ اصطلاحِ قرآنی کو مسخ کرنے سے حاصل کیا' یعنی بجائے ''اُولُوا الْاَمْرِ مِنْکُمْ'' کے' صرف ''اُولُوا الْاَمْرِ'' کہا۔ کسے باشد' ان کی بلا سے' مسلمانوں پر جو چاہے حکومت کرے' صرف شرط یہ ہے کہ قادیانی مقربین کی صف میں شامل ہوں۔ انگریزوں کو حاکم تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ جہاد کا منسوخ قرار دیا جانا قادیانی مذہب کے لئے ناگزیر تھا' کیونکہ ایک طرف مسلمانوں کو انگریزوں کے اتباع کی تلقین کی جائے اور دوسری طرف وہ ان کے خلاف جہاد پر آمادہ ہو جائیں تو خدمت سرکار کا اہتمام نہیں ہوتا۔

اللہ تعالیٰ بھی فرماتا ہے کہ بات سیدھی کہو۔ ادھر ان کی تاویل آمیز تفاسیر میں الجھاؤ ہی

الجھاؤ تھا۔ موقع ملے تو بال کی کھال اتارنے سے دریغ نہیں کرتے اور منطق کام نہ آئے تو ''الہامی'' حوالے دیئے جاتے ہیں' جس کا اس کے سوا اور کیا جواب دیا جاسکتا ہے کہ ۔

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے
غارت گر اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

لیکن' یہ بہت بعد کی باتیں ہیں۔ مرزا محمود احمد نے دعویٰ کیا کہ انہیں قرآن کریم کی تفسیر خوابوں میں سمجھائی گئی۔ اب انسان کسی عام نکتے پر تو بحث کرسکتا ہے' لیکن اس نکتے پر کیا اظہار رائے کرے' جو خوابوں کے ذریعے کسی کی طبیعت رسا پر وارد اور منکشف ہوا ہو' ان کے خوابوں میں کسی اور کا کیسے گزر ہوسکتا تھا۔ مجھے عمر کے ساتھ ساتھ قادیانیت کے محرکات اور مضمرات پر سوچ بچار کا موقع ملا' اس وقت بھی مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اس جماعت کا مقصد اُولیٰ اُمت مسلمہ کی وحدت و تنظیم کی جڑیں کاٹنا ہے۔ وہ مسلمانوں سے ایسی صورت میں وابستہ رہنے پر اصرار کر رہے تھے' جب ان کے جماعتی مفادات ان کے قطعی خلاف تھے۔ اوّل تو وہ برصغیر میں انگریزوں کے زوال کے تصور کو ہی ناممکن سمجھتے تھے' ان کی تمام سیاست کا تکیہ انگریزی تسلط کے مستقل قیام پر تھا۔ وہ اگر مسلمانوں کے ساتھ نظر آتے تھے تو اس لئے کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق پر اپنا حق جما سکیں۔ آخر ظفر اللہ خاں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل میں مسلمان کہلانے کی بنا پر پہنچے۔ یہ امر انگریزوں اور قادیانیوں دونوں کو راس تھا' اس طرح انگریزوں کو وفادار نائب ملتے تھے اور قادیانیوں کو تقسیم انعامات میں خصوصی حصہ۔ دوسری طرف وہ کانگریس سے بھی رابطہ رکھتے تھے کہ داخلی طور پر انتقالِ اقتدار ہوا تو وہ بہت بڑی جماعت کی حیثیت سے اکثر صوبوں کے حاکم ہوں گے اور وہ یقیناً انگریزوں کی طرح ایسی جماعت کو استعمال کرنا چاہیں گے' جس کا ایمان ہی ''اُولُوا الْاَمْرِ'' کی اطاعت ہے۔ لیکن جب یہ سیاسی گومگو کی حالت زیادہ عرصہ قائم نہ رہ سکی اور افق پر جنگ کے آثار سے یہ ظاہر ہونا شروع ہوگیا کہ انگریز کو ہندوستان کے متعلق فیصلہ کرنا پڑے گا' تو قادیانی اصلیت اظہر من الشمس ہو گئی اور انہوں نے صاف طور پر برصغیر کی تقسیم کے خلاف اکھنڈ بھارت کے تصور کو ترجیح دی۔ بات یہ تھی کہ جب تک انگریز کا سایہ عاطفت قائم تھا' ان کے لئے دوغلے پن کی گنجائش تھی' وہ اپنے آپ کو مسلمانوں کا ہمدرد بھی ظاہر کر سکتے تھے اور ہندوؤں سے سیاسی لین دین بھی کر سکتے تھے' لیکن انگریز کے بعد کی صورت حالات میں ان کے لئے دو میں سے ایک متبادل کا انتخاب کرنا لازمی ہوگیا کہ اکھنڈ بھارت میں ان کے پنپنے کے زیادہ امکانات ہیں یا پاکستان

میں؟ اب انہیں صاف نظر آیا کہ ایک خالص اسلامی مملکت میں ان کا گزارا نہیں ہوسکتا اور اس کے مقابل' اکھنڈ بھارت میں' جہاں کانگریس سیکولر طرزِ حکومت قائم کرنا چاہتی ہے' انہیں اپنی جمعیت کو مضبوط کرنے کا خاصا موقع ملے گا' پھر وہ تو ازلی وفادار ہیں' کانگریس انہیں مسلمانوں پر بہرحال ترجیح دے گی' جن کی سرشت میں غیر مسلمانوں کے خلاف بغاوت لکھی ہوئی ہے اور جن کی اکثریت تحریک پاکستان کی مؤید ہونے کی وجہ سے راندۂ درگاہ ہوگی۔ سو قادیانیوں نے اپنا پورا وزن برصغیر کی سیاست کے ترازو میں مسلم لیگ کے مخالف پلڑے میں ڈال دیا۔

بے شک یہ پیش رفت اس زمانے سے تعلق نہیں رکھتی جب میں قادیانیوں کے متعلق سوچ رہا تھا' لیکن ان کی باتیں سن کر اور ان کا طرزِ عمل دیکھ کر میرے دل میں کوئی شک وشبہ نہ رہا تھا کہ بالآخر وہ کس طرف جائیں گے۔ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے' ہم عموماً اپنے فہم کی تسکین دلیلوں اور لفظوں کے استعمال میں ڈھونڈتے ہیں' لیکن قرآن کریم مشاہدے پر زور دیتا ہے۔ پوچھا کہ ہم مرنے کے بعد دوبارہ کیسے اٹھیں گے؟ جواب ملا' تو آپ پیدا کیسے ہوئے تھے؟ جو خالق ایک بار پیدا کرسکتا ہے وہ دوسری بار بھی اٹھا سکتا ہے۔ علم کا اصل منبع ہی مشاہدہ ہے اور میرے مشاہدے نے میرے اندر بدرجۂ اتم یہ ایقان پیدا کر دیا کہ قادیانیوں کا مسلمانوں سے کوئی علاقہ نہیں اور میں اپنے لئے مسلمانوں کا راستہ انتخاب کر چکا تھا۔

قادیانیت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے پیروکار مرزا صاحب کی پیشین گوئیوں پر بہت انحصار کرتے ہیں' بات بات پر اُن کی پیشین گوئیوں کا حوالہ دیتے ہیں اور ان کے پورا ہونے کی تشہیر کرتے ہیں۔ ضمناً ان کی ایک پیشین گوئی قطعی مسلمانوں کے حق میں نہ تھی۔ جب بنگال کے ہندو تقسیم بنگال' جو عین مسلمانوں کے فائدے میں تھی' کے خلاف تحریک چلا رہے تھے' تو مرزا صاحب کو الہام ہوا کہ ''دلجوئی کی جائے گی''۔ اب جب ۱۹۱۱ء میں تقسیم کے فیصلے کو منسوخ کر دیا گیا تو حقیقتاً دلجوئی ہندوؤں کی ہوئی' قادیانی حضرات کہہ سکتے ہیں کہ اس سے غرض نہیں پیشین گوئی کس کے حق میں پوری ہوئی' انہیں تو اس کے اہتمام سے غرض ہے۔ قادیانی پیشینگوئیوں کی صداقت کے اس قدر قائل ہیں کہ وہ انہیں بروئے کار لانے کی بھی کوشش کرتے ہیں' چنانچہ ایک پیشین گوئی کے مطابق حضرت مسیح علیہ السلام کی بعثت ثانی دمشق کے ایک کنارے پر ہوگی۔ چنانچہ ایک طرف تو قادیان میں منارۃ المسیح بنوایا گیا۔ رہتی کسر مرزا محمود احمد صاحب نے پوری کر دی کہ جب وہ سفر یورپ پر جا رہے تھے یا آ رہے تھے' دمشق ٹھہرے اور وہاں کی مسجد کے مینارے پر چڑھے' وہ خود تو ''مسیح موعود'' نہ تھے' ان کا دعویٰ

صرف ''مصلح موعود'' ہونے کا تھا' لیکن جس حد تک وہ مرزا صاحب کے فرزند اور خلیفہ ہونے تک ان کی نمائندگی کر سکتے تھے انہوں نے اس پیشین گوئی کو اپنے باپ کی طرف سے پورا کر دیا۔ میرا پیشینگوئیوں کے متعلق تفصیل بتانے کا مقصد یہ اتمامِ حجت ہے کہ قادیانی انہیں اپنے مستقبل کا دارومدار سمجھتے ہیں۔ اب ایک اہم معاملے میں مرزا صاحب کی پیشین گوئی سے بالکل الٹ نتیجہ پیدا ہوا۔ قادیان' جس کے متعلق ان کا ایک شعر ہے۔

زمین قادیاں محترم ہے
ہجومِ خلق سے ارضِ حرم ہے

قادیان جس قدر قادیانیوں کو محبوب ہو سکتا ہے' اس کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ قادیان کے متعلق مرزا صاحب نے پیشین گوئی کی تھی کہ وہ اتنی ترقی کرے گا کہ اس کا ایک سرا دریائے بیاس تک جا ملے گا اور اس کی شان و شوکت دیکھ کر لوگ کہیں گے کہ کبھی لاہور ہوتا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت اس کی عظمت کے سامنے لاہور ماند ہو گا۔

قادیانیوں کو میں نے شروع ہی سے مسلمانوں سے الگ پایا تھا۔ مثلاً قادیان کی زندگی میں ہمارا ان معدودے چند مسلمانوں سے کوئی واسطہ نہ تھا جو وہاں رہتے تھے۔ قادیان کا ایک بازار ''بڑا بازار'' کہلاتا تھا اور اس میں زیادہ تر ہندوؤں اور مسلمانوں کی دکانیں تھیں۔ جب میں اس بازار سے گزرتا تو کبھی کبھی ایک سبزی کی دکان پر کھڑا ہو جاتا' جس کے مالک کا لڑکا ہمارا ہم جماعت تھا۔ مجھے میری اس حرکت پر سرزنش کی گئی کہ میں کسی ''غیر احمدی'' سے سکول کے باہر کیوں تعلق رکھتا ہوں۔ پھر قادیانیوں کی مسلمانوں سے رشتہ داریاں بھی نہ ہوتیں۔ قادیانی مَردوں کے لئے مسلمان لڑکیاں تو جائز تھیں لیکن قادیانی لڑکی کا کسی مسلمان لڑکے سے رشتہ قطعی ناجائز تھا۔ جب کبھی خاندانی تعلقات کی بنا پر ایسا ہو جاتا تو ''مجرم'' کا بائیکاٹ ہوتا۔ قادیانیوں کے لئے مسلمانوں کے پیچھے نماز پڑھنے کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا تھا' وہ مسلمانوں کی نماز جنازہ تک پڑھنے کے روادار نہ تھے۔ چنانچہ ظفر اللہ خاں نے قائداعظم کا جنازہ نہیں پڑھا اور لاکھوں کے مجمع میں الگ بیٹھے رہے۔ جب چوہدری صاحب سے پوچھا گیا کہ وہ مسلمانوں کا نماز جنازہ کیوں نہیں پڑھتے' تو انہوں نے جواب دیا کہ جو ہمیں کافر کہیں' ان کا ہم جنازہ نہیں پڑھتے۔ اسی سانس میں انہوں نے بڑے فخر سے بتایا کہ قائداعظم ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے دنوں میں (جب ظفر اللہ خان وہاں ریلوے ممبر تھے) ان کے مداح تھے اور انہیں مسلمان سمجھتے تھے (اگر اسے سچ مان لیا جائے) تو سوال اٹھتا ہے کہ پھر آپ

نے قائداعظم کا جنازہ کیوں نہ پڑھا؟ وہ آپ کو کافر بھی نہ کہتے تھے اور آپ کے محسن بھی تھے کہ ان کے علاوہ پاکستان میں کس کو جرأت ہو سکتی تھی کہ ظفر اللہ خان کو وزیر خارجہ بنا دے۔ مسلمانوں سے الگ تشخص قائم کرنے کی دھن میں وہ اتنی دور گئے کہ اپنا ایک کیلنڈر بھی اختراع کر لیا۔ لیکن اُس زمانے میں مَیں قادیانی زندگی کی ان خصوصیات کی وجہ کو سمجھ نہ سکا تھا۔ اب قادیان سے باہر وسیع تر میدان میں جب میں نے قادیانیوں کے مسلمانوں سے غیر جانبدارانہ بلکہ معاندانہ طرزِ عمل کو دیکھا' تو اس کی وجوہات پر غور کرنے پر مجبور ہوا۔ مسلمانوں میں فرقہ بازی نئی چیز نہیں' کئی فرقے ہیں' لیکن قادیانیوں کا باوا آدم نرالا تھا' ان کا الگ مذہبی وجود ہی نہ تھا' وہ اپنے منفرد سیاسی وجود پر بھی مصر تھے۔

جب میں نے ان کے عقائد کا مطالعہ کیا تو بنیادی خرابی ان کے عقائد میں یہ نظر آئی کہ مرزا غلام احمد قادیانی نبی ہیں' کیونکہ نبوت تو لامحالہ الگ اُمت کی متقاضی ہوتی ہے' اگر مرزا غلام احمد قادیانی دعویٰ نبوت کر کے مسلمانوں سے الگ امت کا بانی بن جائے' تو لوگوں کو اختیار تھا کہ اس دعویٰ کو اپنے اپنے معتقدات کی روشنی میں پرکھ لیتے۔ مسلمانوں کے لئے تو رسول اللہ ﷺ کے بعد' جو خاتم النبیین ہیں اور جن کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان پر اپنی نعمت دین مکمل کر دی ہے' کسی اور رسول کی گنجائش نہ تھی' لیکن غیر مسلم جو چاہے وطیرہ اختیار کرتے۔ ایران میں بہاء اللہ نے یہی طرزِ عمل اختیار کیا۔ اب خدا کا کرنا کیا ہوا کہ مشرقی پنجاب کے دوسرے شہر تو مسلمانوں کے نکل آنے پر ہندوؤں اور سکھوں نے آباد کر دیئے' لیکن قادیان کی کوئی تجارتی یا دوسری اہمیت نہ تھی۔ اس کی اہمیت یہی تھی کہ وہ مرزائیوں کا مرکز ہے جس تک ریلوے لائن بھی اس لئے بچھائی گئی کہ چوہدری ظفر اللہ خاں وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے' ورنہ مسافروں کی آمد و رفت اس کے لئے کوئی جواز مہیا نہ کرتی تھی۔ اس لئے تقسیم پر قادیانی تو اسے چھوڑنے پر مجبور ہو گئے کہ جان کا خطرہ تھا' لیکن ہندوؤں اور سکھوں نے اسے آباد کرنے کے لائق نہ جانا اور میں نے سنا کہ اب وہاں ہمارے مکانوں میں گدھے بندھے ہیں۔ گویا قادیان کی صرف رونق ہی ضائع نہ ہوئی' وہ بالکل ویران ہو گیا۔ اس سے زیادہ پیشین گوئی کے غلط ہونے کا اہتمام نہ ہو سکتا تھا۔ چونکہ میں ۱۹۴۹ء سے لندن میں تھا اور مجھے تقسیم کے بعد' قادیان کی مکمل تباہی کے بارے میں قادیانیوں کے ردِ عمل کا علم نہ تھا' اس لئے جب میں ۱۹۵۰ء میں واپس آیا تو یہ معلوم کرنے کے لئے بہت متجسس تھا کہ اس المیے کا ان کے دلوں میں کیا اثر ہوا ہو گا' لوگوں کے قدم تو اس پیشین گوئی کی تعبیر معکوس

سے ڈگمگا گئے ہوں گے' لیکن میری حیرانی کی انتہا نہ رہی' جب میں نے دیکھا کہ اس حادثے سے ان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ یہ احساس کا فقدان تھا یا تاویلوں کی تاثیر' ان کے ایمانوں میں کوئی فرق نہ پڑا تھا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ ایک کوشش کبھی نہیں ہوئی' اسلام میں کسی اور نبوت کے اجراء کے لئے دروازہ نہ کھولا گیا' یہ جسارت صرف ہندوستان میں انگریزوں کی عملداری میں ہوئی۔ قادیانیت' انگریزوں کی سنگینوں کے تلے پروان چڑھی۔ قادیانی نبوت سراسر دوراز کار تاویلات کی تصنیف ہے' کہیں مسیح علیہ السلام کی بعثت ثانیہ کا سہارا لیا گیا ہے' کہیں ضعیف حدیثوں پر انحصار کیا گیا ہے' کہیں پوچ استدلال پر۔ مثلاً یہ دلیل کہ انعامات خداوندی کبھی بند نہیں ہوتے' تو نبوت کا دروازہ کیسے بند ہو سکتا ہے' جسے ایک قادیانی شاعر نے گھڑی سے تشبیہہ دی ہے۔

کیا فائدہ رکھنے کا گھڑی جیب میں یارو
جب وقت کی پڑتال پہ پاتے ہو گھڑی بند

لیکن' جب اللہ تعالیٰ نے نوع انسانی پر رسول اللہ ﷺ کے ذریعے اپنی نصیحت پوری کر دی تو آپ کو خاتم النبیین قرار دیا۔ اسلام نیا مذہب نہیں' یہ وہی پیغام ہے جو حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام پر وحی کیا گیا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ پر اس پیغام کی تکمیل ہوئی اور اس تکمیل اور اتمام نعمت کا خاصہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم کی حفاظت کا ذمہ لیا' جبکہ توریت اور انجیل کے متعلق اس قسم کی ذمہ داری نہیں اٹھائی اور اسی وجہ سے ان میں تحریف ہوئی۔ ان صریح احکامات میں کسی تاویل کی گنجائش نہیں۔ چونکہ' اسلام میں یہ نکات بنیادی تھے' ان پر پوری اُمت کا اجماع ہوا اور اسلام میں چودہ سو سال تک کسی نے دعوائے نبوت نہیں کیا' تا آنکہ قادیان سے مرزا غلام احمد نے اپنی صدا لگائی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہندوستانی ''نبوت'' کی اس لئے ضرورت پڑی کہ فی زمانہ مسلمانوں کی حالت بہت گر چکی تھی تو امت پر اس سے پہلے بھی بڑے بڑے بحران آئے' تب کسی ''نبوت'' کا بندوبست کیوں نہ ہوا؟ پھر قادیانیوں نے اوّل کام ہی یہ کیا کہ وہ مسلمانوں سے کٹ گئے اور انہوں نے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ تعمیر کی۔ پھر انہوں نے صرف مسلمانوں سے سروکار ہی نہ رکھا' بلکہ ان کے خلاف کام کیا۔

قادیانیوں نے اپنی ''نبوت'' کے جواز میں عجیب دلیلیں دی ہیں۔ ایک یہ کہ مرزا قادیانی کی ''نبوت'' سے رسول اللہ ﷺ کا مقام اور بلند ہوتا ہے کہ ان کے امتی بھی ''نبی''

بننے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ ایک دفاعی دلیل ہے کہ کہیں یہ نہ کہا جائے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی شان میں گستاخی کی ہے' ورنہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ع ''چہ بے خبر ز مقامِ محمد عربی است''۔

اگر انہوں نے ایک طرف یہ کہا تو دوسری طرف ان سے اپنی حقانیت میں یہ بیان بھی سنا گیا کہ اگر چوہدری ظفر اللہ خاں جیسا لائق آدمی (یہ بات ان دنوں خاص طور پر کہی جاتی تھی' جب چوہدری صاحب وائسرائے کونسل کے رکن تھے) مرزا صاحب کو ''نبی'' مانتا ہے تو اس سے زیادہ ان کی ''صداقت'' کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے! انہی پوچ باتوں نے مجھے قادیانی موقف سے بیزار کیا' مجھے یقین ہوگیا کہ قادیانیوں نے سنجیدگی سے نبوت کے متعلق سوچا نہیں یا ان میں سنجیدہ فکر کی اہلیت ہی نہیں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر وہ اپنے عقیدے سے وابستہ ہیں تو دنیا میں لوگ طرح طرح کی بوالعجبیوں کو مانتے ہیں' انسانی ذہن ہر عقیدے کا جواز ڈھونڈ لیتا ہے' لیکن' بہرحال قادیانیت کو اسلام کے اس عالمگیر مقصد سے کوئی تعلق نہیں اور اس کا کوئی درک نہیں جو ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ﴾ میں مضمر رکھا گیا ہے کہ اسلام کل انسانیت کے لئے ہے اور اس لئے رسول اللہ ﷺ پوری نوع انسانی کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے۔ وہ کسی خاص قوم کے لئے نہیں آئے' جیسا کہ حضرت عیسیٰ کا مقصد بنی اسرائیل کے دین کی تجدید تھا۔ وہ خاتم النبیینؐ تھے' جس کا مطلب ہے اسلام دنیا کے قیام سے آخیر تک انسانیت کو راہ ہدایت دکھاتا رہے گا اور وہ اس کے سوا اور کوئی نجات اُخروی کا ذریعہ نہ پائے گی۔ اس عظیم الشان مشن کا تقاضا تھا کہ قرآن کریم محفوظ رہے اور اس کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لے رکھی ہے اور تاریخ کی شہادت ہے' وہ چودہ سو سال بعد بھی حرف بحرف وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تھا اور تا قیامت اسی طرح تحریف سے محفوظ رہے گا اور دوسرے اُمت مسلمہ کا وجود ثابت و سالم رہے گا' کیونکہ اگر وہ منقسم' متفرق اور منتشر ہوگئے' تو اسلام کی قوت نفوذ ختم ہوجائے گی۔ اسلام کی سرمدی تعلیم مسلمانوں کے ٹھوس جسد سیاست کی مقتضی تھی' وہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم تھے۔ اب تاریخ اس امر پر بھی شاہد ہے کہ باوجود اس حقیقت کے کہ مسلمانوں پر ہر قسم کی فکری و جماعتی اور سیاسی آفتیں آئیں' ان کا قلب صحیح اور زندہ رہا۔ بے شک درجنوں فرقے پیدا ہوئے' مسلمانوں پر عروج کے ساتھ زوال آیا اور وہ اغیار کے دست نگر اور تابع بھی بنے' لیکن ان میں اپنی وحدت کا جذبہ کبھی سرد نہ پڑا اور صداقت یہی ہے کہ وہ ہر امتحان اور آزمائش کے بعد ابھرے۔

اس ناقابل شکست' زندہ احساسِ وحدت کا' جو ہر زمانے میں مسلمانانِ عالم میں جاری وساری رہا' رکن اعلیٰ اور عاملِ اعظم وہ گہرا تعلق ہے جو مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ بابرکات سے رہا اور جو اِسی طرح قائم رہ سکا کہ وہ خاتم النبیین تھے اور کوئی اور نبی یا پیغامبر مسلمانوں اور رسول اللہ ﷺ کے درمیان حائل نہیں ہوا۔ یہ ناقابل تردید نفسیاتی حقیقت ہے کہ اگر خدانخواستہ کوئی تیسرا عامل کسی شخص یا ادارے کی صورت میں رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کے درمیان حائل ہو جاتا تو یہ قلبی تعلق' جو مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ سے محسوس ہوتا ہے اور جس پر ہر دوسرا تعلق قربان کیا جا سکتا ہے' قائم نہ رہ سکتا۔ جس کا مطلب ہے' اُمت کی وحدت معرضِ انتشار میں پڑ جاتی۔ اس حقیقت کے ثبوت میں خود قادیانیوں کے طرزِ عمل کی مثال دی جا سکتی ہے۔ کہنے کو تو وہ رسول اللہ ﷺ سے بہت عشق ومحبت کا اظہار کرتے ہیں' لیکن عملی صورت کیا ہے؟ ان کے گھروں میں ہر وقت مرزا صاحب کا ذکر ہوتا ہے۔ مرزا صاحب سے ان کے پیروؤں کے تعلق کے متعلق وہ خود ایک لطیفہ بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک آدمی کے متعلق مرزا صاحب کو معلوم ہوا کہ وہ ان کے متعلق بحث کے سلسلے میں کسی مسلمان سے لڑ پڑا' مرزا صاحب نے اسے کہا کہ تمہیں نہیں لڑنا چاہئے تھا' تو اس شخص نے جواب دیا کہ آپ اپنے آقا (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے بارے میں ہر ایک سے لڑتے ہیں' میں اپنے آقا (مرزا صاحب) کے بارے میں کیوں نہ لڑوں؟ اس قادیانی کے لئے ''آقا'' کا مفہوم بدل گیا' رسول اللہ ﷺ اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے لئے خاتم النبیین کے مقام کا تعین محض ان کی عظمت کے اظہار کے لئے نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ کی اس تدبیر کے ماتحت ہے کہ اسلام ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دین انسانیت بنا دیا گیا ہے اور اس تدبیر کو عملی جامہ پہنانے کے لئے نہ صرف قرآن کریم ابد تک محفوظ رہے گا' بلکہ اُمت مسلمہ کا وجود سالم وثابت رہے گا اور جس کا سراسر انحصار رسول اللہ ﷺ سے مسلمانوں کے تعلق پر ہے۔ اللہ تعالیٰ کی یہ تدابیر اتنی ہی غیر مبدل ہیں جیسے کائنات کا نظام۔ سورج مشرق سے چڑھے گا اور مغرب میں غروب ہو گا' زمین سورج کے گرد گردش کرتی رہے گی اور چاند زمین کے گرد چکر لگاتا رہے گا' دن رات کے تعاقب میں لگا رہے گا اور رات دن کے۔ جب مُردہ شہر پر پانی برسے گا تو اس سے ہر قسم کی سبزیاں اُگیں گی' تا آنکہ یومِ موعود آ جائے اور زمین اپنے ربّ کے نور سے منور ہو جائے۔ oo

تحریک آزادیٔ نسواں

تہذیب جدید کے مضمرات

تحریر: محترمہ ڈاکٹر شمشاد امتیاز ☆

ہمارے ہاں مغرب کی فکری یلغار کے نتیجے میں جو جدید اور پیچیدہ مسائل پیدا ہوئے ہیں ان میں ایک ''مساواتِ مرد و زن'' کا مسئلہ ہے۔ اس کے نتیجے میں یک جنسیت کی وبا پھوٹ پڑی جس کے بھیانک نتائج رونما ہو رہے ہیں۔

طلاق کی کثرت، خاندانی نظام کی تباہی، اسقاطِ حمل کی خوفناک شرح، جنسی جرائم کی بہتات، کثرتِ زنا، زنا بالجبر، کنواری ماؤں کا ہجوم، ناجائز بچوں کا سیلاب، ایڈز اور دیگر جنسی امراض کا ظہور، یہ سب اسی مساواتِ مرد و زن کے شجرِ خبیثہ کے برگ و بار ہیں۔ اس چیز نے انسانیت کو حیوانیت کی پستی میں گرا دیا ہے۔ مقامِ تعجب ہے کہ ایک طرف مغرب کا انسان سمندر کی اتھاہ گہرائیوں میں تجربات کرتا ہے، خلا کو چیرتا اور کہکشاں سے الجھتا ہے اور دوسری جانب اس کی زندگی کا کردار جانوروں سے بھی گیا گزرا ہے۔ غالباً اسی صورت حال کی طرف علامہ اقبال مرحوم نے اشارہ کیا تھا کہ:

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا!

اسلام کے تصورِ مساواتِ مرد و زن اور مغرب کے نظریۂ مساوات مرد و زن میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور یہ کہ آج مغرب نے عورت کو آزادی کے نام سے فریب دے کر

☆ حلقہ خواتین تحریک اسلامی پاکستان

اسے دوہری غلامی میں جکڑ دیا ہے اور یہ کہ عورت کی مظلومیت کے لئے اگر کوئی راہِ نجات ہے تو وہ ہے اسلام۔

کائنات کے وجود میں ساری اشیاء کے ساتھ ساتھ انسان مَرد اور عورت دنیا میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیمات مکمل کر دی ہیں اور مکمل احکامات بھیج دیئے ہیں۔ ان کو سامنے رکھ کر سمجھا جا سکتا ہے کہ مَرد اور عورت کا physical structure بالکل مختلف اور ان کا دائرہ کار بالکل الگ الگ ہے۔ الحمدللہ مَرد نے آج تک اپنے مقصدِ وجود سے نہ کبھی اختلاف کیا ہے اور نہ انکار و انحراف۔

یہ تو صرف زن ہی ہے جو مختلف ادوار میں کبھی مَردوں کے اکسانے پر اور کبھی اپنی جیسی خواتین کے کہنے پر اپنے مقصدِ زندگی سے انحراف پر تل جاتی ہے اور صرف اپنا نقصان ہی نہیں بلکہ مَرد اور پوری انسانیت کا نقصان بھی کر جاتی ہے اور کائنات میں عدم توازن کی مرتکب ہوتی ہے۔ وہ کیسے؟ مختصراً دیکھتے ہیں۔

قرآن کی فطری تقسیم میں اللہ تعالیٰ نے ایک صنف کو طاقت، قوت اور انفاق کی فضیلت بخشی ہے، جبکہ دوسری صنف کو حمل و زچگی کی اہم ترین سرفرازی سے نوازا ہے۔ عورت کا دائرہ کار اُس کا گھر بیان کیا گیا ہے، جس میں اس حکم کی مصلحت و حکمت بیان کی اور گھر کے ماحول کی اصلاح و درستگی کا بندوبست کیا۔ لیکن بحیثیت انسان ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔ دینی معاملات میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں اللہ کے ہاں یکساں ذمہ دار اور جواب دہ ہیں۔ البتہ تہذیب و تمدن کو فروغ دینے کے لئے مَرد بیرون خانہ کے تمام کام مثلاً سیاست، معیشت، زراعت، تجارت، صنعت و حرفت، فوجی دفاع وغیرہ کا ذمہ دار ہے جبکہ آئندہ نسل کی تخلیق، پرورش، تربیت، خانہ داری وغیرہ جملہ کام عورت کے ذمہ کئے گئے ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا:

((.....وَالْمَرْاَةُ رَاعِيَةٌ فِيْ بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُوْلَةٌ عَنْ رَّعِيَّتِهَا)) (۱)

''عورت اپنے خاوند کے گھر (اور اولاد) کی نگران ہے اور ان کے بارے میں جواب دہ ہے''۔

معاملہ ٹھیک ٹھیک چل رہا تھا۔ الحمدللہ ترقی کے وہ بہترین دَور جو مسلم اور غیر مسلم سلطنتوں

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجمعة، باب الجمعة فی القری و المدن

نے دیکھے' ان میں عورت گھر میں تھی۔ وہ گھر کی ذمہ داریاں ادا کر رہی تھی اور مرد باہر کی۔ انسائیکلو پیڈیا میں ہے کہ جب رومی سلطنت ترقی کے عروج پر تھی تو خاتون گھر میں تھی' اور جب نکلتی تو پردے کے ساتھ نکلتی تھی۔

گزشتہ صدی میں مغرب میں اٹھنے والی تحریک آزادئ نسواں (Feminism) نے تقریباً ایک صدی میں نہ صرف پورے یورپ اور امریکہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے بلکہ ایشیائی ممالک اور خصوصاً مسلم ممالک میں بھی اپنے پنجے گاڑ دیئے ہیں۔ یہ تحریک اب مغربی تہذیب کا جزو لاینفک بن چکی ہے۔

تحریک آزادئ نسواں کے اغراض و مقاصد

اس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں:

۱) عورت کو معاشرتی' اقتصادی اور سیاسی غرض زندگی کے ہر شعبے میں وہی حقوق حاصل ہوں جو مردوں کو حاصل ہیں۔

۲) ان کی شخصی آزادی پر کسی قسم کی قدغن نہ ہو۔

۳) دفتروں اور کارخانوں کی ملازمت ہو یا آزاد تجارتی اور صنعتی پیشے' مختلف قسم کے کھیل ہوں یا دوسرے تفریحی مشاغل' ان سب میں مردوں کے شانہ بشانہ حصہ لینے اور ساتھ چلنے کا حق رکھتی ہو۔

۴) ازدواجی زندگی کی ذمہ داریاں' بچوں کی پرورش' شوہر اور بزرگوں کا احترام وغیرہ سب دقیانوسی باتیں ہیں۔

۵) اور یہ تہذیب اس بات کی بھی دعوے دار ہے کہ عورت کو سب سے زیادہ حقوق اسی نے دیئے ہیں۔

اب مغرب میں اس تحریک کے نتیجے میں عورتوں کی آزادی اور بے باکی اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ ان میں نسائیت کی پاکیزگی اور اخلاق و عفت کی رمق تک باقی نہیں رہی۔ اُن میں برائی کا احساس مر چکا ہے' شرم و حیا اُن کی آنکھوں سے رخصت ہو چکی ہے اور غیرت اُن کے نزدیک ایک بے معنی لفظ کی حیثیت رکھتی ہے۔ کسی نے کہا:

> ''یورپ کے پارکوں' باغوں اور چوراہوں اور تفریح گاہوں میں مرد و عورت کے اختلاط کے شرمناک مناظر دیکھ کر ضمیر چیخ اٹھتا ہے کہ یہ انسان نہیں جانور ہیں جنہوں نے خوشنما لباس پہن رکھے ہیں۔ انسان سے لغزش اور بھول چوک تو ہو سکتی ہے مگر وہ

اس قدر بے حیا' اتنا بے شرم اور اس قدر بے غیرت تو نہیں ہو جاتا' آخر گراوٹ کی کوئی تو حد ہونی چاہئے''۔

مغرب کے صحیح الفکر مفکرین اور دانشور بھی شدید ذہنی عذاب میں مبتلا ہیں اور وہ اب اپنی تحریروں میں عورت کی مادر پدر آزادی پر شدید تنقید کر رہے ہیں۔

یہ تحریک امریکہ میں ۱۸۴۸ء میں شروع ہوئی' جب وہاں کے قوانین نے جذبات کا منشور پیش کیا اور تقریباً یہی مطالبات رکھے اور کہا کہ عورت مَرد کی غلام ہے' شادی شدہ عورت کی زندگی تو بالکل درگور کر دینے کے برابر ہے' چنانچہ مَرد سے اسے رہائی دلائی جائے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ مسلسل جلسے وجلوسوں کے ذریعے اپنے مطالبات پیش کرتی رہیں گی۔ بالآخر ۱۹۱۷ء سے ۱۹۴۶ء تک امریکہ' برطانیہ' فرانس اور سوئیٹزرلینڈ کی خواتین کو ووٹ کا حق مل گیا۔

۱۹۵۲ء میں یو این او کی طرف سے یہ حق ملا۔ عورت اور مَرد کے یکساں حقوق تسلیم کر لئے گئے اور عورت کو طلاق دینے کا حق بھی مل گیا۔ ۱۹۷۰ء میں اسقاطِ حمل کا حق بھی مل گیا۔

یو این او نے ایک کمیشن تشکیل دیا جس نے ۳۰ سال کام کر کے ایک دستاویز تیار کی جس کا نام تھا CEDAW Document۔ یعنی:

"Convention of UNO on the limitation of all kinds of discrimination against women"

۱۹۷۰ء میں جنرل اسمبلی نے بھی یہ حقوق تسلیم کر لئے۔ ۱۹۸۱ء میں یو این او کے بیس ممالک نے اس رپورٹ پر دستخط کر دیئے۔ ۱۹۹۹ء میں سو ممالک نے دستخط کئے جن میں دس مسلم ممالک بھی شامل تھے۔ ۱۹۹۴ء میں قاہرہ میں یو این او کی طرف سے بہبودِ آبادی کانفرنس منعقد ہوئی جس کا خصوصی نشانہ مسلم ممالک تھے۔ اس میں وہی پوائنٹس تھے۔ یعنی جنسی بے راہ روی کی اجازت اور condom culture رائج کرنے کی کوشش۔

پھر ۱۹۹۵ء میں بیجنگ کانفرنس' جو یو این او کی طرف سے خواتین کی چوتھی بڑی کانفرنس تھی' جس میں دو سو ممالک کے پچاس ہزار نمائندے شامل ہوئے' ۳۰,۰۰۰ سرکاری اور ۲۰,۰۰۰ غیر سرکاری یعنی این جی اوز کے نمائندے۔

مطالبات

۱) مرد و عورت میں کوئی فطری فرق موجود نہیں۔

۲) عورت کے روائتی کردار ماں، بیٹی اور بیوی کو اُس ڈرافٹ میں خصوصاً تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔
۳) اسمبلیوں اور دیگر اداروں میں ۵۰ فیصد کوٹہ رکھا جائے۔
۴) ملازمتوں میں ۵۰ فیصد کوٹہ رکھا جائے۔
۵) بچے پیدا کرنے کا اختیار عورت کو ملنا چاہئے، یعنی اس پر خاوند یا کسی اور کا دباؤ نہ ہو۔ اپنی مرضی سے اور اپنے اختیار سے چاہے تو بچے کو جنم دے اور چاہے تو ضائع کر دے، یعنی اسقاط کروادے۔
۶) اسقاطِ حمل کو جائز قرار دیا جائے اور اس کا حق عورت کے پاس ہو (یہ کہ عورت جنسی بے راہ روی سے اگر حاملہ ہو جائے تو اسے عزت کے ساتھ اسقاطِ حمل کا حق دیا جائے)۔
۷) عورتوں کو بھی Homosexuality یعنی ہم جنسیت کی اجازت دی جائے۔
۸) جسم فروشی کی اجازت دی جائے۔

اور اس کانفرنس میں شادی اور نکاح وغیرہ کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ گویا مردوں کی مخالفت کرتے کرتے عورتیں اس انتہا کو پہنچ گئیں کہ جس کو تذلیل انسانیت کہنا زیادہ موزوں ہے۔

اس ننگ نسوانیت ایجنڈے کی مخالفت کی:

(i) پاپائے روم نے
(ii) کیتھولک عیسائیوں نے
(iii) سعودی عرب نے مکمل بائیکاٹ کیا۔
(iv) سوڈان اور ایران نے اس حیا سوز ایجنڈے کی مخالفت کی۔
(v) مگر پاکستان کی وزیراعظم (بے نظیر بھٹو) اس کی Chair Person بھی بنیں اور پاکستان کی طرف سے اس ننگ نسوانیت ایجنڈے پر دستخط کر دیئے۔

جون ۲۰۰۰ء میں بیجنگ پلس فائیو کانفرنس منعقد ہوئی جس میں یہودیوں کا خوفناک شیطانی منصوبہ پیش کیا گیا، جس میں دنیا کے مختلف ممالک کے ہم خیال شیطانی دماغ مل کر بیٹھے۔

اہمیت:

اس لحاظ سے اس کانفرنس کی زیادہ اہمیت تھی کہ اس میں بیجنگ کانفرنس کے دوران طے کئے گئے این جی اوز کے بارہ نکاتی ایجنڈے کی توثیق اقوام متحدہ کی طرف سے کروا کر اسے تمام ممبر ممالک پر حکماً نافذ کرنے کا پروگرام تھا اور اس کی خلاف ورزی پر اقوامِ عالم مجرم ممالک کے خلاف ایکشن لینے کی مجاز قرار دی گئیں، یعنی عمل نہ کرنے والے ممالک پر عراق و

کیوبا جیسی اقتصادی پابندی اور طاقت کا استعمال بھی کیا جا سکتا تھا۔

خصوصی ایجنڈا

۱) خاتون خانہ کو گھریلو ذمہ داریوں اور پھر تولیدی خدمات پر باقاعدہ معاوضہ دیا جائے۔
۲) ازدواجی عصمت دری (Marital Rape) پر قانون سازی اور فیملی کورٹس کے ذریعے مرد کو سزا دلوانا۔ (شوہر کا بیوی پر کوئی حق نہیں)
۳) طوائف کو جنسی کارکن تسلیم کرنا۔
۴) ممبر ممالک میں جنسی تعلیم اور کنڈوم کے استعمال پر زور دینا۔
۵) اسقاطِ حمل کو عورت کا جائز حق قرار دینا۔
۶) ہم جنس پرستی کا فروغ۔

پاکستان میں اس کانفرنس کے اثرات پر ایک نظر:

۱۹۹۴ء میں قاہرہ کانفرنس کے بعد (۱) این جی اوز کا قیام (۲) فیملی پلاننگ کی بہت زیادہ اہمیت۔ امریکہ نے اس کے لئے بے تحاشا فنڈز دینے شروع کر دیئے۔ جگہ جگہ بہبودِ آبادی سنٹر کھل گئے۔

☆ ستارہ اور چابی والی گولیاں ملک میں عام ہوئیں۔
☆ ایڈز سے بچاؤ کے بہانے ہم جنس پرستی کے بارے میں وسیع پروپیگنڈہ کیا گیا۔
☆ وطن عزیز میں بے حیائی اور فحاشی کو بہت فروغ حاصل ہوا۔
☆ پرنٹ اور الیکٹرانک ذرائع ابلاغ، ٹی وی، کیبل، ڈش، انٹرنیٹ وغیرہ کے ذریعے فحاشی کے مظاہر بڑھے۔
☆ اغوا، ریپ، گینگ ریپ اور گھروں سے دوشیزاؤں کے فرار جیسے واقعات میں اضافہ ہوا۔
☆ اسی منظر میں صائمہ ارشد لو میرج کیس بھی منظر عام پر آیا جس نے مغربی یلغار کو وطن عزیز میں مزید فروغ دیا۔
☆ خواتین بینک قائم ہوئے۔
☆ خواتین پولیس اسٹیشن بنے۔
☆ خواتین تحقیقاتی کمیشن قائم کیا گیا جس کی سربراہ عاصمہ جہانگیر ہیں (جو اللہ سے بے خوفی میں اتنا بڑھ چکی کہ علی الاعلان کہا تھا کہ اگر ہماری گواہی آدھی ہے تو ہماری نماز اور روزہ

بھی آدھا ہے۔(استغفراللہ)

☆ ۱۹۹۷ء میں اس کمیشن نے اپنا ایجنڈ اپیش کیا جو بالکل بیجنگ کانفرنس کا ایجنڈ اتھا۔

☆ انہوں نے غیرت کے نام پر قتل پر واویلا مچایا۔ان کا ہدف قتل نہیں بلکہ غیرت کا جنازہ تھا۔

☆ ہماری فوجی حکومت کی کابینہ نے بلدیاتی انتخابات میں عورتوں کو ۵۰ فیصد نشستیں دینے کا اعلان کر دیا۔

ہمارے عوام کا کوئی خاص ردّعمل سامنے نہ آیا کہ ہمارے ملک کی اکثریت ان چالوں سے نابلد ہے۔

اس کانفرنس کا مقصد صرف اور صرف نوجوان نسل کی اخلاقی بے راہ روی اور والدین سے بغاوت پیدا کرنا تھا۔ یہ حملہ صرف مسلم اقدار کے خلاف نہیں بلکہ دنیا بھر میں انسانی حقوق کے پردے میں تمام انسانی رشتوں اور خود انسان کی پہچان تبدیل کر دینے کے مترادف ہے۔

غور وفکر کا مقام

کانفرنس کے محرکین کو عورت سے کوئی ہمدردی نہیں ہے۔ اگر فی الواقع ایسا ہوتا تو کشمیر، فلسطین، کوسوو، اراکان اور دیگر خطوں میں جبری عصمت دری کا شکار ہونے والی عورتوں کا مسئلہ ایجنڈے میں موجود ہوتا، لیکن ان کی توجہ صرف خرافات پر ہی رہی۔ یہ دراصل اسلام کے خاندانی نظام کو اور اخلاقی اقدار کو بیخ و بن سے اکھاڑ کر کفر کے نظام کو اُن پر مسلط کرنے کی سازش ہے۔

جب ایڈز دریافت ہوا اور وجہ یہ معلوم ہوئی کہ یہ عملِ قومِ لوط اور اخلاقی بے راہ روی کا شاخسانہ ہے، یہ بدکار کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ تھا کہ انسان دور ہی سے پہچانا جاتا ہے کہ بدکار ہے۔ پہلے پہل روس اور امریکہ کے بڑے بڑے دانشور مل کر غور وفکر کے لئے بیٹھے کہ اس گھناؤنی بیماری سے کیسے نجات حاصل کی جائے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آئی کہ بچپن ہی سے لڑکے اور لڑکی کو سیکس (sex) کی تعلیم سے دور رکھا جائے اور اسلام کی طرز کا نظامِ معاشرت متعارف کروایا جائے، لیکن جب مُنہ زور سوسائٹی سے واسطہ پڑا اور یہ بات ناممکن معلوم ہوئی تو یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ ساری مسلم دنیا کو بھی اپنے ہی رنگ میں رنگ لو، تاکہ کوئی انگلی اٹھانے والا نہ رہے..... چنانچہ آج ان کانفرنسز کے پس منظر میں یہ کوششیں کامیاب نظر آ رہی ہیں۔

اس کی ایک شق کہ ''خاتون خانہ کو گھریلو کاموں اور تولیدی خدمات پر معاوضہ دیا جائے'' انتہائی شرمناک مطالبہ ہے۔عورت تو اپنے گھر کی مالکہ ہے۔مرد مشکل ترین کام کرتا

ہے یعنی معاش کے لئے جدوجہد اور محنت سے کمائی ہوئی دولت لا کر عورت کے ہاتھ پر رکھ دیتا ہے کہ وہ اس کو اپنی صوابدید کے مطابق خرچ کرے' حتیٰ کہ وہ اپنی ضرورت کے لئے پیسہ بھی عورت سے مانگتا ہے۔ کیا مرد عورت کو اپنا مزدور یا ملازم سمجھ کر یہ پیسہ اس کے حوالے کرتا ہے؟؟

وہی عورت اپنے بچوں کو جنم دیتی ہے' پرورش کرتی ہے تو اُس کی نفسیات کی تسکین ہوتی ہے۔ کوئی عورت بچے کے بغیر اپنے آپ کو مکمل نہیں سمجھتی۔ اس کی مامتا کا یہ تقاضا ہوتا ہے کہ اس کے ہاں بچہ ہو' تا کہ اُس کی ذات کی تکمیل ہو سکے۔ پھر اُس کے جگر کے ٹکڑے' اس کے گوشت پوست کو کوئی اور کیوں پالے! وہ خود کیوں نہ اس کے لئے راتوں کو جاگ کر اور آرام اور نیندیں قربان کر کے اس کی پرورش کرے۔

بچے کی خوشی ماں کی خوشی ہے اور بچے کی بیماری عورت کو مضمحل کر دیتی ہے۔ اس خوشی اور فرحت کا نعم البدل دنیا کی کون سی چیز بن سکتی ہے؟ کیا انسانی حقوق کے نام نہاد علمبردار حقیقی والدہ کو نوکر بنا کر رکھ دینا چاہتے ہیں۔ آپ خود سوچ لیں کہ مامتا پر جو عظیم اجر ملنے والا ہے اس کی بجائے دفتروں میں ملازمت کر کے اور مرد سے اس خدمت کا معاوضہ طلب کر کے چند ٹکے حاصل کر لینا باعث فخر و غرور ہے یا اُس کی مامتا کے مُنہ پر زوردار طمانچہ؟

مغربی معاشرے کی تباہ حالی

مغرب کے معاشرے کی تباہ حالی کو مسلمان عورت آنکھ کھول کر دیکھے اور پھر اس کی تقلید کرے۔

۱) شرم وحیا کا جنازہ اٹھ چکا ہے۔

۲) سرعام جنسی مناظر' فحش مناظر

۳) بالجبر زیادتی کے واقعات۔ کم ہی کوئی کیس پولیس تک پہنچتا ہے۔ شکار ہونے والی عورتوں کی عمر ۲ ماہ کی بچی سے ۸۵ سال کی عورت تک۔ ۱۹۷۵ء تک ۴۸ فیصد اضافہ۔

۴) بہبود آبادی کے نام سے گند Abortion Clinics' جہاں ناجائز حمل کا باعزت اسقاط ہوتا ہے اور اب پاکستان میں بھی جگہ جگہ یہ سب کچھ میسر ہے۔ اچھی اچھی مسلمان ڈاکٹرز نے اب ان Abortions کا نام رکھا ہے Regularisation of menses۔ یعنی یہ پراپیگنڈہ کہ ۴۵ دن سے ۶۰ دن تک کے بچے کو ضائع کرنا کوئی گناہ نہیں۔ حالانکہ قرآن کی رو سے یہ حرام ہے' فیملی پلاننگ کے کلینکس میں مادر

پدر آزادی جائز اور ناجائز اولادوں کے اسقاط کی بھرمار۔ بہت سی عورتیں انہی چکروں میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہیں۔ کوئی پکڑنے والا نہیں' کوئی منع کرنے والا نہیں' اور میڈیا کی فحاشی نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی ہے۔

۵) مغرب میں ۱۳ تا ۱۶ سال تک کی بچی مانع حمل گولیاں استعمال کرتی ہے۔ ۱۵۔۱۶ سال کی بچیاں ناجائز حمل اور ناجائز اولاد کے ساتھ زندگی بسر کرنے میں کوئی عار نہیں سمجھتیں۔ جنسی امراض اور ایڈز میں ہر سال اضافہ ہو رہا ہے۔ امراضِ خبیثہ کی کثرت کا یہ عالم کہ اللہ کی پناہ۔ آخر اللہ کا قہر نازل ہونے سے کیا چیز روکے ہوئے ہے؟ ایک ڈاکٹر نے ایک واقعہ سنایا۔ ۱۹۸۵ء میں ایک مریضہ نے دائیوں سے اپنا بچہ ضائع کروا یا تو حالت بہت serious ہوگئی۔ ڈاکٹر نے جب اس کا پیٹ کھولا تو اس کی انتڑیوں میں ۲۰۰ جگہ سوراخ ہو چکے تھے' وہیں وہ موت سے ہمکنار ہوگئی۔

۶) بچوں میں خودکشی کا رجحان' خصوصاً حرام اور ناجائز اولادوں میں' جن کو اپنے ماں باپ کا کوئی علم نہیں ہوتا۔

۷) ماں باپ کی طرف سے اولادیں بدسلوکی کا شکار ہیں جبکہ جانوروں سے زیادہ محبت کی جاتی ہے۔

۸) بوڑھے معذور Old Houses میں رہنے پر مجبور ہیں۔ حکومت ہی ان کا واحد سہارا ہوتی ہے۔ ضعیف والدین کی خدمت ویسے بھی مغربی معاشرے کی روایات کے خلاف ہے۔

۹) انتہا یہ کہ محرمات سے زنا کے واقعات بھی کچھ کم نہیں۔ استغفراللہ۔ بقول شخصے ''مغربی عورت جوانی میں عیش کرتی ہے' بڑھاپے میں پچھتاتی ہے اور پھر تنہائی دور کرنے کے لئے کتے بلیاں یا بندر پالتی ہے''۔ علامہ اقبال نے کیا خوب فرمایا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہو گا

چنانچہ آج کی مسلمان عورت کا رول اکیسویں صدی میں انتہائی اہمیت کا حامل ہوگا۔ اسے جدید علوم سے آشنا ہو کر اپنے اسلاف سے رشتہ جوڑتے ہوئے قرآن سے فیض یاب ہو کر اپنے آقا محمد ﷺ کے نقشِ پا پر اعتماد سے قدم اٹھانا ہوگا اور نئی صدی کی شیطانی چالوں کو سمجھتے ہوئے مسلمان عورت کا باوقار روپ پیش کرنا ہوگا۔ ان شاءاللہ!

بانی تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** حفظہ اللہ

کے دروس وتقاریر پر مشتمل CD (آڈیو MP3)

بعنوان:

اسلام اور خواتین

جس میں اہم معاشرتی موضوعات کے بارے میں

قرآن وسنت کی راہنمائی میں 16 تقاریر شامل ہیں

﴿اہم موضوعات﴾

- خواتین اور سماجی رسومات
- خواتین کی دینی ذمہ داریاں
- شادی بیاہ کی رسومات
- اسلام میں عورت کا مقام
- مثالی مسلمان خاتون
- جہاد میں خواتین کا کردار
- اسلام میں شرائط حجاب کے احکام
- قرآن اور پردہ

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور' فون:03-5869501 'فیکس:5834000

قسط وار سلسلہ (10)

جدید دنیائے اسلام

انڈونیشیا (Indonesia)

تحقیق وتحریر: سید قاسم محمود

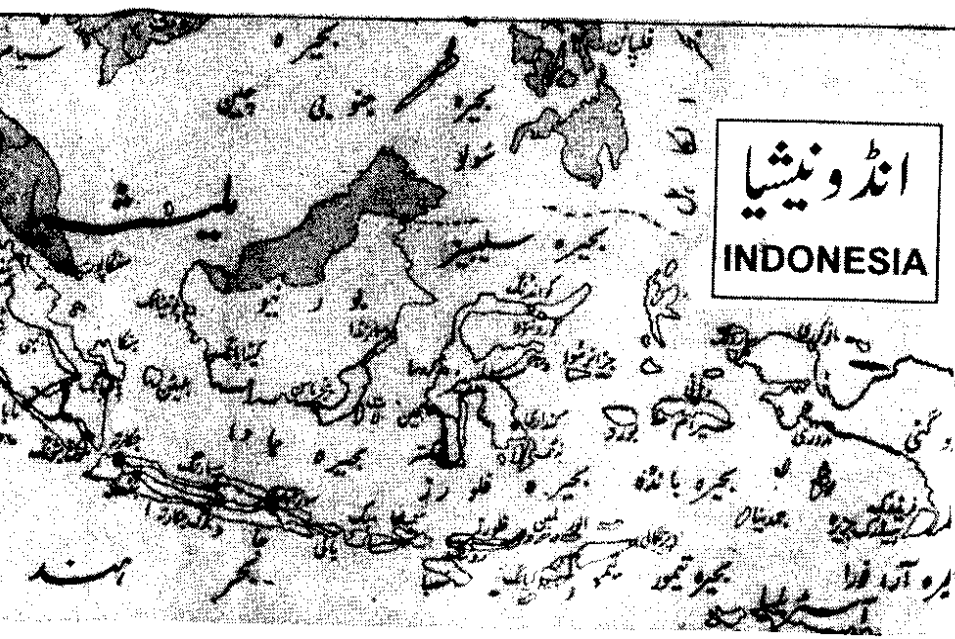

انڈونیشیا: ایک نظر میں

سرکاری نام: ری پبلک انڈونیشیا
صدرِ مملکت: میگاوتی سوئیکارنو پتری (2001ء)
رقبہ: 19 لاکھ 19 ہزار 440 مربع کلومیٹر (7 لاکھ 41 ہزار 96 مربع میل)
آبادی: تقریباً 23 کروڑ 48 لاکھ
شرح افزائش (آبادی): 1.5 فیصد سالانہ
شرح پیدائش: 22 فی ہزار
شرح اموات اطفال: 38.2 فی ہزار
گنجائش: 317 فی مربع میل
دارالحکومت: جکارتہ شہر (88 لاکھ)، جکارتہ ضلع (ایک کروڑ 79 لاکھ)
دوسرے بڑے شہر: سوربیا (30 لاکھ)، بندوگ (27 لاکھ)، میدان (22 لاکھ)، سمارنگ (13 لاکھ)
کرنسی: روپیہ = 100 سن
زبانیں: بہاسا انڈونیشی (قومی زبان)، جاوی، ولندیزی، انگریزی اور 583 سے زیادہ زبانیں اور بولیاں
نسلیں: جاوی (45 فی صد)، سندانی (14 فی صد)، مدوری (7.5 فی صد)، ملاوی (7.5 فی صد) اور دیگر 26 فی صد۔
مذاہب: اسلام 88 فیصد، عیسائی 9 فیصد، ہندو 2 فیصد، دیگر ایک فیصد
شرح خواندگی: 84 فیصد

مجموعی قومی پیداوار: 687 ارب ڈالر
فی کس آمدنی: تین ہزار ڈالر سالانہ
شرح افزائش (معیشت) 3.3 فی صد
افراطِ زر: 11.5 فیصد
بے روزگاری: 8 فیصد
قابل کاشت رقبہ: 10 فیصد
زراعت: چاول، اخروٹ، سویابین، تمباکو، کافی، ناریل، چائے، چینی، نیل، پام آئل، کالی مرچ، الائچی اور گرم مصالحہ، پولٹری، بیف، انڈے۔
صنعت: پٹرولیم اور قدرتی گیس، خوراک سازی، پارچہ بافی، کان کنی، تیل کی صفائی، سیمنٹ، کھاد، پلائی وڈ، ربڑ، سیاحت
معدنیات: ٹین، تیل، کوئلہ، بکسائٹ، مینگانیز، تانبا، نکل، سونا اور چاندی۔
برآمدات: تیل اور گیس، بجلی کا سامان، پلائی وڈ، کپڑا، ربڑ، جوتے۔ مالیت 56.5 ارب ڈالر
درآمدات: مشینری اور متعلقہ ساز و سامان، پلائی وڈ، کیمیکل، غذائی ضروریات
تجارتی ساتھی: جاپان، امریکا، سنگاپور، جنوبی کوریا، چین، ملائشیا، آسٹریلیا

انڈونیشیا آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ یہ براعظم ایشیا کے جنوب مشرق میں ایک ایسا عجیب وغریب ملک ہے جو سترہ ہزار جزیروں پر پھیلا ہوا ہے۔ ان میں سے چھ ہزار جزیرے آباد ہیں اور باقی گیارہ ہزار جزیروں پر انسانی آبادی بالکل نہیں ہے یا بہت کم ہے۔ پہلے اس کا نام جزائر شرق الہند (East Indies) تھا جسے 1921ء میں حریت پسندوں نے انڈونیشیا کا نام دیا۔ اس کے جزائر کو جغرافیائی لحاظ سے چار بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

(1) مغربی جزائر' جن میں جاوا' سماٹرا' بنکا' مادورا' بورنیو' بلتیون وغیرہ شامل ہیں۔

(2) جزائر سوندا' جن میں مالی' لمبوک' سومبا' تیمور' روتی' فلورس اور سمباوا کے جزیرے شامل ہیں۔

(3) مشرقی جزائر' جن میں سلولیسی اور مالو کے جزائر شامل ہیں۔

(4) مغربی ایریان' نیوگنی وغیرہ۔

جغرافیائی خدوخال

ارضی خدوخال کے اعتبار سے انڈونیشیا کے جزائر میں ساحلی میدان اور شکن دار پہاڑ پائے جاتے ہیں۔ جاوا اور سماٹرا میں بعض پہاڑی چوٹیاں سطح سمندر سے پانچ سو میٹر اونچی ہیں' جہاں سال بھر موسم خوشگوار رہتا ہے۔ مغربی جزائر کم گہرے سمندروں میں واقع ہیں' جن کی گہرائی بعض مقامات پر صرف دو سو فٹ رہ جاتی ہے اور ساحلوں سے متصل زمین اکثر دلدلوں پر مشتمل ہے' اسی لئے ماہرین ارضیات کا خیال ہے کہ چند لاکھ سال پیشتر یہ جزیرے براعظم ایشیا کا جزو تھے۔

آتش فشاں پہاڑوں کا سلسلہ خربوزے کی قاش کی طرح سماٹرا' جاوا اور مالوکا میں سے ہوتا ہوا شمال میں فلپائن تک چلا گیا ہے۔ ملک میں ایک سو سے زائد آتش فشاں پہاڑ بیدار ہیں (نصف تعداد جاوا میں)۔ ان سے دو قسم کا لاوا نکلتا ہے۔ تیزابی لاوا زمین کو بنجر اور اساسی لاوا زمین کو بے حد زرخیز بناتا ہے۔ بیشتر پہاڑوں پر گھنے جنگل ہیں۔ جھاڑیوں اور گھاس کے لمبے لمبے میدان بھی ہیں' جنہیں ''سوانا'' کہتے ہیں۔ یہاں جھاڑیوں اور دیو قامت گھاس کے سوا کچھ نہیں اگتا۔ چنانچہ دلدلوں کی طرح سوانا بھی انسانوں کے لئے بے سود ہے۔ انڈونیشیا کا ساحل دنیا کے سب سے لمبے ساحلوں میں شمار ہوتا ہے۔

آب وہوا مرطوب استوائی ہے۔ مون سون ہواؤں کی زد میں ہونے کے باعث بارش بکثرت ہوتی ہے۔ ضرورت سے زیادہ بارش سے دلدلیں بنتی ہیں۔ گھنے جنگل پھلتے پھولتے ہیں اور روئیدگی کا یہ حال ہے کہ فصل کے لئے تیار کی ہوئی زمین ذرا سے تساہل کی وجہ سے جھاڑیوں کا جنگل بن جاتی ہے۔ انڈونیشیا کے خاصے حصے میں بارش ضرورت کے عین مطابق ہوتی ہے اور بعض مقامات (مثلاً جاوا) کو انتہائی زرخیز بناتی ہے۔

مجموعی طور پر موسم گرم ہوتا ہے' لیکن سمندر کے قرب کے باعث منطقہ حارہ جیسی گرمی نہیں

پڑتی۔ خطِ استوا پر واقع ہونے کی وجہ سے دن اور رات تقریباً برابر رہتے ہیں اور درجہ حرارت بھی سال بھر قریب قریب یکساں رہتا ہے (اوسطاً 80 درجہ فارن ہائیٹ)۔

تاریخی پس منظر

انڈونیشیا میں انسانی آبادی انتہائی قدیم زمانے میں بھی موجود تھی۔ برفانی دور سے قبل یہ مجمع الجزائر باقی براعظم ایشیا سے ملا ہوا تھا۔ چنانچہ مختلف وقتوں میں ایشیا کے مختلف علاقوں اور نسلوں کے باشندے یہاں آتے رہے۔ بہرکیف اس امر کے شواہد موجود ہیں کہ پتھر کے زمانے میں یہاں سیاہ فام بونے تھے جو آسٹریلیا کے قدیم وحشیوں سے مشابہ تھے۔ تقریباً آٹھ ہزار سال قبل اس علاقے میں بادامی رنگ کی ایک مخلوط نسل کے باشندے آئے، جن کا تعلق ہندوستان اور ہند چینی سے آنے والی مخلوط نسلوں سے تھا۔ یہ نسل جاوائی کہلائی۔ اس کے بعد ملیشائی نسل کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا، جس میں کاکیشائی، منگولی اور زنگی نسلوں کی آمیزش تھی۔ ان کی آمد پر ابتدائی سیاہ فام باشندوں نے بحرالکاہل کے مختلف جزیروں یا انڈونیشیا کے اندرونی علاقوں میں پناہ لی۔ گویا انڈونیشیا کے مختلف جزائر میں جو نسلیں آج پائی جاتی ہیں، انہوں نے مختلف نسلوں کی آمیزش سے اپنی موجودہ شکل اختیار کی ہے۔

ابتدائی عہد کے لوگ بالکل وحشی یا نیم وحشی تھے۔ مذہب مظاہر پرستی تھا۔ بھوت پریت کو بھی مانتے تھے، البتہ بت پرستی معدوم تھی۔ اس زمانے کے آخری دور میں وہ کھیتی باڑی کرتے تھے اور جانوروں کو چَراتے تھے۔ مُردوں کو زمین میں دفن کرتے تھے۔ جھونپڑیوں میں رہتے تھے۔ درختوں کی چھال کا لباس پہنتے تھے۔ ہڈیوں کے اوزار بناتے تھے اور مچھلیوں اور جانوروں کا شکار کرتے تھے۔ مجموعی طور پر اُن کی زندگی نہایت سادہ تھی۔ پوری آبادی کا ایک سردار (نگاری نگارا) ہوتا تھا، جسے دیوتا کا درجہ دیا جاتا تھا۔

انڈونیشیا میں تاریخی دور کا آغاز ہندوؤں کی آمد سے ہوتا ہے۔ ہندو اس ملک میں تجارت کی غرض سے آئے تھے اور اُن کی آمد کا زمانہ پہلی دوسری عیسوی کا ہے۔ رفتہ رفتہ ان کی تعداد بڑھنے لگی اور جاوا کے ان علاقوں میں ان کی نو آبادیاں قائم ہونے لگیں، جہاں گرم مسالے پیدا ہوتے تھے۔ نو آبادیاں بڑھیں تو ریاستیں بن گئیں اور ریاستوں نے ترقی کر کے سلطنتوں کی شکل اختیار کر لی۔ ہندومت عام مذہب بن گیا۔ ہندوؤں نے یہاں اپنی تہذیب کو پوری طرح پھیلایا اور یوں انڈونیشیا میں ہندو مذہب اور ہندو تہذیب کی جڑیں بہت مضبوط ہو گئیں۔

جاوا کا پہلا ہندو راجا آچی سا کا تھا۔ آٹھویں صدی میں سری وجایا کی وسیع سلطنت سماٹرا میں موجود تھی، جس کی حدود آگے چل کر بورنیو، فلپائن، سلولیسی، نصف جاوا، نصف فارموسا اور سیلون تک جا پہنچیں۔ سرکاری زبان سنسکرت تھی۔ جاوا کی ایک اور قابلِ ذکر سلطنت کیدیری تھی، جس کا زمانۂ عروج 1042ء تا 1222ء بتایا جاتا ہے۔ یہ مضبوط سلطنت مستقل نظم و نسق کی حامل اور ایک باقاعدہ ہندو

تمدنِ کی [illegible]۔ 1222ء سے 1293ء تک سلطنت سنگوساری کا دور رہا' جس کا تختہ رادن وجایا نے اُلٹ کر [illegible] کی مشہور ترین سلطنت مجاپائت (کڑوا پھل) کی بنیاد رکھی اور کرتا راجا ساجایا دردانا کا لقب اختیار کیا۔ اس کا بیٹا جایا نگارا مجاپائت کا سب سے مضبوط حکمران تھا۔ اس نے کالی منتان کو بھی جاوا کی قلمرو میں شامل کرلیا۔ اس کے قابل وزیرِاعظم گجامد نے قریبی ممالک سے سیاسی اور تجارتی تعلقات بڑھائے اور بالآخر اُس کی کوششوں سے مجاپائت کا اقتدار پورے مجمع الجزائر پر چھا گیا۔ چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں خانہ جنگیوں اور بغاوتوں نے اس سلطنت کو بہت کمزور کردیا۔ اِدھر جاوا اور ساٹرا میں اسلام ترقی کر رہا تھا اور نومسلم حاکموں اور مبلغوں نے مضبوط تنظیمیں قائم کرلی تھیں۔ اسلام کو دبانے اور مسلمانوں کو کچلنے کے لئے ہندو راجا اور اس کے حاکموں کے مظالم حد سے بڑھ گئے تو مسلمانوں نے متحد ہو کر مقابلہ کیا اور مجاپائت کا خاتمہ کردیا۔ شاہی خاندان اور دوسرے امراء نے جاوا سے بھاگ کر بالی میں پناہ لی' جہاں کے ہندو آج بھی اپنی قدیم روایات کے حامل ہیں۔

اشاعت اسلام کا دَور

تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی اسلامی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ پہلی صدی ہجری (ساتویں صدی عیسوی) کے بعد اسلام کی اشاعت اور توسیع جس قدر تیرھویں اور چودھویں صدی میں ہوئی اتنی کسی اور زمانے میں نہیں ہوئی۔ اسی زمانے میں منگولوں نے اسلام قبول کیا اور مسلمانوں کے اثرات سائبیریا سے روس اور وسط یورپ تک پھیلے۔ اسی زمانے میں افریقہ میں صحرائے اعظم اور اُس کے جنوبی علاقوں میں اسلام پھیلا۔ یہی وہ زمانہ ہے جس میں پورا ہندوستان مسلمانوں کے زیرِاقتدار آیا' اور یہی وہ صدیاں ہیں جن میں انڈونیشیا اور ملائیشیا کے وسیع و عریض خطے میں اسلام پھیلا۔ تیرھویں اور چودھویں صدی کا زمانہ صرف اس لحاظ سے قابلِ ذکر نہیں کہ اس زمانے میں مسلمان سیاسی میدان میں نقطۂ عروج پر پہنچ گئے' اور ایشیا' یورپ اور افریقہ میں جتنے وسیع علاقے پر اُن کا اقتدار ہوگیا' اتنے وسیع علاقے پر نہ اس سے پہلے ان کا اقتدار قائم ہوا تھا اور نہ بعد میں قائم ہوا' بلکہ یہ دور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس زمانے میں اسلام کی بھی توسیع و اشاعت ہوئی اور جو ملک مسلمانوں کے زیرِاقتدار آئے' ان کی ایک بڑی تعداد نے اسلام قبول کرلیا اور وہ آج بھی مسلمان ہیں۔ مغربی افریقہ' بنگلہ دیش' پاکستان' ملائیشیا اور انڈونیشیا مسلمانوں کی اِن پُرامن شاندار فتوحات کی نمایاں مثالیں ہیں۔

انڈونیشیا آج آبادی کے لحاظ سے دنیا کا سب سے بڑا ملک ہے' لیکن تیرھویں صدی عیسوی سے قبل وہاں ایک بھی مسلمان نہیں تھا۔ لوگ یا تو ہندو تھے یا مظاہر پرست۔ اسلام کا یہاں قدم جمانا اور پھر تمام جزائر پر چھا جانا جہاں ایک عجیب اور مہتم بالشان واقعہ ہے وہاں غیرمسلموں کے اس دعوے کا مؤثر جواب بھی ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا' کیونکہ انڈونیشیا کو مسلمان حملہ آوروں نے فتح

نہیں کیا' بلکہ مسلمان مبلغوں اور تاجروں نے مختلف جزیروں میں راجاؤں' امیروں اور عوام کو دینِ حق کی تبلیغ اور اپنے اوصافِ حمیدہ سے متاثر کر کے اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ جس طرح برعظیم پاک و ہند میں اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین نے اپنی تبلیغی کاوشوں سے اسلام کی اشاعت کی' اسی طرح انڈونیشیا اور ملائیشیا میں بھی اسلام انہی بزرگوں کی بدولت پھیلا۔ یہ بزرگ یا تو عرب تھے یا بھارتی علاقے گجرات کے رہنے والے مسلمان تاجر۔

مبلغین اسلام کا کردار

ان مبلغوں میں ایک مولانا ملک ابراہیم ہیں۔ انہوں نے 1391ء میں جاوا میں تبلیغ اسلام کا کام شروع کیا۔ مولانا ابراہیم گجرات کاٹھیاواڑ کے ایک تاجر تھے۔ مشرقی جاوا کی بندرگاہ گریسک کے ہندو راجہ نے ایک مرتبہ ان سے علاج کرایا اور جب وہ اچھا ہو گیا تو ان کے ہاتھ پر اُس نے اسلام قبول کر لیا۔ مولانا ملک ابراہیم نے راجا کا اسلامی نام رادن رحمت رکھا۔ ملک ابراہیم کا 1419ء میں انتقال ہو گیا۔ گریسک میں ان کی قبر آج تک موجود ہے۔ ملک ابراہیم مولانا مغربی کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ وہ اور راجا رادن رحمت جاوا کے ان مشہور ولیوں میں شمار کئے جاتے ہیں جو ''سونان'' کے لقب سے مشہور ہیں اور جنہوں نے اس جزیرے میں اسلام پھیلایا۔ جاوا میں اسلام پھیلانے والے ان نو اولیائے کرام کے نام یہ ہیں:

1) مولانا ملک ابراہیم یا مولانا مغربی
2) رادن رحمت' جن کا مزار سورابایا کے قریب نمپل کی پہاڑی پر ہے۔ وہ سونان نمپل کے نام سے مشہور ہیں۔
3) مخدوم ابراہیم جن کو سونان بونانگ بھی کہا جاتا ہے' یہ رادن رحمت کے لڑکے تھے۔
4) رادن پاکو۔ یہ سونان گیری کے نام سے مشہور ہیں۔
5) فتح اللہ یا سونان گنتگ جاتی۔
6) سونان قدس' جن کا مزار سمیرانگ کے قریب ہے۔
7) سونان موریا
8) سونان درجات
9) سونان کالی جاگا

ایک اور نامور مبلغ رادن فاتح تھے' جن کی قیادت میں مبلغین اسلام نے 1428ء میں مجاپائت کے حکمران کو شکست دی اور جاوا میں پہلی اسلامی سلطنت قائم کی۔

جاوا میں پہلی مسجد دیماک کے مقام پر تعمیر کی گئی تھی۔ اس مسجد سے تبلیغی جماعتیں جاوا کے مختلف حصوں میں بھیجی جاتی تھیں۔ جس مقام کے لوگ اسلام قبول کر لیتے' وہاں مسجد اور مدرسہ قائم کر لیتے۔

تبلیغ کا یہ سلسلہ سولہویں صدی کے وسط تک جاری رہا' یہاں تک کہ انڈونیشیا کے باشندوں کی اکثریت مسلمان ہوگئی اور ملک میں تقریباً بیس مسلم ریاستیں قائم ہوگئیں۔ان ریاستوں کے حکمران جو سلطان کہلاتے تھے' خود بھی تبلیغ اسلام کے کام سے گہری دلچسپی رکھتے تھے' اور بعض حکمران تو ایسے تھے کہ انہوں نے تاج وتخت چھوڑ کر خود کو تبلیغ اسلام کے لئے وقف کر دیا تھا۔ان نیک حکمرانوں میں مغربی جاوا کے علاقہ بامتن کے سلطان پاتح ہلا (فتح اللہ) کا نام بہت مشہور ہے۔انہوں نے تخت وتاج چھوڑ کر 1552ء سے 1570ء کے دوران' اپنی وفات تک' اٹھارہ سال مسلسل اسلام کی تبلیغ کی۔چنانچہ اُن کا شمار جاوا کے نو اولیاء میں ہوتا ہے۔پاتح ہلا کے فرزند سلطان حسن الدین نے بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے آخر میں خود کو تبلیغ اسلام کے لئے وقف کر دیا تھا۔اس طرح ان حکمرانوں نے اسلام سے اپنی والہانہ محبت کی ایسی مثال قائم کی جس کی نظیر تاریخ اسلام میں کم ملے گی۔

مجمع الجزائر میں سب سے پہلے ساٹرا نے اسلامی اثرات قبول کئے۔بارہویں صدی عیسوی کے اوائل میں آچے کے کچھ باشندے شیخ عبداللہ عارف کی کوششوں سے مسلمان ہوئے۔ان کے خلیفہ شیخ برہان الدین نے مغربی اور جنوبی ساٹرا میں دین کی وسیع اشاعت کی۔انہوں نے ایک مدرسہ قائم کیا' جہاں نومسلموں کو دینی تعلیم دی جاتی تھی اور تبلیغ کے اصول سکھائے جاتے تھے۔ان نومسلم مبلغوں نے مختلف علاقوں میں جا کر اسلام کا پیغام پہنچایا اور آچے کا پورا علاقہ اسلام کے زیر اثر آ گیا' حتیٰ کہ یہاں 1205ء میں پہلی اسلامی ریاست وجود میں آئی۔چودھویں صدی عیسوی میں شیخ اسماعیل کے زیر قیادت کچھ مبلغین حجاز سے پہنچے' جن کی مساعی سے سدرا' آروا اور میننگ کباؤ کے راجا اور باشندے مسلمان ہوگئے۔پندرہویں صدی میں پالم بانگ اور لمپانگ کے راجاؤں اور باشندوں نے بھی اسلام قبول کرلیا۔

بورنیو میں اشاعتِ اسلام کا آغاز پندرہویں صدی کے آغاز میں ہو چکا تھا' مگر مجاپائت کے خاتمے پر یکے بعد دیگرے بنجر ماسین' دامک' برونی اور سکدانہ کے حکمران اور عوام مسلمان ہوتے گئے۔بورنیو میں مبلغین کے سردار شیخ شمس الدین حجاز سے آئے تھے۔ان کے ہاتھ پر سکدانہ کے راجا نے اسلام قبول کیا اور سلطان محمد صفی الدین کا لقب پایا۔

جزیرہ سلولیسی میں اسلام بورنیو کے نومسلموں کی بدولت پھیلا۔سب سے پہلے مکاسر اور بوگی قومیں اور پھر اہل منہاسہ مسلمان ہوئے۔مؤخر الذکر کو پرتگالیوں نے عیسائی بنالیا تھا۔مکاسر کے نومسلم خاص طور پر بڑے پُر جوش مبلغ ثابت ہوئے۔

جزائر مالوکا (ملاکا) میں اسلام کی ابتدا پندرہویں صدی عیسوی سے ہوئی' جب ایک عرب مبلغ شیخ منصور نے تدورے کے راجا کو مسلمان کر کے اس کا نام سلطان جلال الدین رکھا۔اسی زمانے میں ترناتے کے راجا نے بھی مسلمان ہو کر اپنا نام سلطان زین العابدین رکھا۔اس کے جانشین سلطان باب

اللہ کی کوششوں سے جزائر مالوکا میں دور دور تک اسلام پھیل گیا۔

جزائر سوندا میں تبلیغ کا فرض مکاسر کے منظم اور پُر جوش مبلغین نے انجام دیا۔ سولہویں صدی میں سمباوا اور اس کے بعد فلورس، تیمور اور سمبا میں بھی اسلام پھیل گیا۔ اس طرح مبلغوں کی ایک منظم تحریک نے، جس کے پاس سیاسی اقتدار تھا نہ عسکری طاقت، ایسی قوموں کو مسلمان کر لیا جو بڑی بڑی سلطنتوں کی مالک اور اپنے مذہب اور تہذیب و معاشرت کی سختی سے پابند تھیں۔

اسلامی سلطنتیں

انڈونیشیا میں مسلمانوں کی پہلی سلطنت سماٹرا کے علاقہ سمدرا میں قائم ہوئی، جس کا راجا مسلمان ہو کر سلطان ملک الصالح کے نام سے مشہور ہوا۔ ملک الصالح اور اس کے جانشینوں نے اسلام کی ترقی و اشاعت میں بڑا حصہ لیا۔ 1346ء میں ابن بطوطہ سمدرا پہنچا تو ملک الصالح کا پوتا سلطان زین العابدین حکمران تھا۔ ابن بطوطہ نے اس سلطنت کی خوشحالی، تجارت کی ترقی، امن و امان اور دینی امور میں حکمرانوں کی دلچسپی کی بہت تعریف کی ہے۔ پندرہویں صدی کے وسط میں یہ سلطنت ملکا کے سلطان کے زیر اقتدار آ گئی۔

سماٹرا کی دوسری اہم سلطنت آچے 1496ء میں قائم ہوئی۔ (ابھی ہندوستان میں ظہیر الدین بابر کی آمد میں 30 سال باقی ہیں۔ یہاں لودھی خاندان کی حکومت ہے) اس سلطنت کا بانی عنایت اللہ شاہ تھا۔ جب 1874ء میں ولندیزیوں نے اس پر قبضہ کر لیا تو آچے کے باشندوں نے جہاد کا اعلان کر دیا اور 1907ء تک برابر برسر پیکار رہے۔ آچے مسلمانوں کی بڑی طاقتور سلطنت تھی۔ اس کے بادشاہوں نے ملک کی ترقی اور عوام کی فلاح کے لئے بہت کام کیا اور علوم و فنون کو فروغ دیا۔

1648ء میں مسلمانوں کی ایک سلطنت جنوب مشرقی سماٹرا میں قائم ہوئی، جس کا صدر مقام پالم بانگ تھا اور بانی ابراہیم۔ 1812ء میں سلطان بہاء الدین احمد نے ولندیزیوں کے مقابلے میں انگریزوں کی بالادستی تسلیم کر لی، لیکن جب 1825ء میں انگریز یہاں سے دستبردار ہو گئے تو ولندیزیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔

جاوا میں پہلی اسلامی حکومت اگرچہ امپل میں قائم ہوئی تھی، جس کے حاکم مشہور ولی رادن رحمت تھے، لیکن مسلمانوں کی پہلی سلطنت دیماک تھی، جسے 1428ء میں مجاپائت حکمرانوں کو شکست دے کر رادن فاتح نے قائم کیا۔ 1520ء میں رادن یونس کی حکومت جاپارا سے گریسک تک پھیلی ہوئی تھی اور مادورا اور پالم بانگ بھی اس کے زیر اثر تھے۔ اس کے جانشین ترنگانوں کے عہد میں ماترن، پسوردان اور پاجانگ کے علاقے بھی فتح ہو گئے۔ ترنگانوں کے لڑکے شہزادہ مؤمن کی سعی سے دیماک میں اسلامی علوم کو بہت ترقی ہوئی اور ہندو اثرات زائل کر کے اسلامی زندگی اختیار کرنے پر خاص زور دیا گیا۔ یہ سلطنت 1578ء تک باقی رہی۔

سولہویں صدی عیسوی میں ترنگانوں کے بہنوئی پاتح ہلا (فتح اللہ) نے مغربی جاوا میں سلطنت بانٹن کی بنیاد رکھی۔ فتح اللہ اور اس کے جانشینوں کے عہد میں اسلام کی اشاعت تیزی سے ہوئی' عربی علم وادب کی سرپرستی کی گئی' تجارت کو بہت ترقی ملی اور بانٹن گرم مسالوں کی تجارت کا مرکز بن گیا۔ 1595ء میں ولندیزی تاجر یہاں پہنچے اور جلد ہی انہوں نے بٹاویا میں اپنا تجارتی مرکز اور قلعہ تعمیر کر کے بانٹن پر بالادستی قائم کر لی۔ عبدالفاتح آ گنگ (1651ء تا 1658ء) نے بانٹن کی کھوئی ہوئی عظمت کو بحال کرنے کی کوشش کی' مگر داخلی اختلافات اور سازشوں نے اسے کامیاب نہ ہونے دیا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی بانٹن کی آزادی بھی ختم ہوگئی۔ (1658ء عبدالفاتح کا سالِ وفات ہے اور ہندوستان میں اورنگزیب عالمگیر کی تخت نشینی کا سال)۔

1578ء میں پاجانگ کے تخت پر سنوباتی بیٹھا' جس کا تعلق ماترم کے قدیم حکمران خاندان سے تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کو بڑی وسعت دی۔ 1613ء میں اس کا پوتا سرنگ سنگ سلطان آ گنگ (اعظم) کے لقب سے تخت پر بیٹھا اور واقعی انڈونیشیا کا ایک عظیم حکمران ثابت ہوا۔ اس نے دوسری ریاستوں پر اقتدار قائم کر کے ایک مضبوط اور وسیع سلطنت قائم کی۔ اس نے ایک طرف تو جاوا کی باقی ماندہ ہندو ریاستیں ختم کیں جو مجاپائت خاندان کی بحالی کے لئے سازشوں میں مصروف تھیں اور دوسری طرف بٹاویا پر حملہ کر کے ولندیزی قلعے کو مسمار کر دیا اور ولندیزیوں کو جاوا سے باہر نکال دیا۔ اس کی زندگی میں ولندیزیوں کو دوبارہ جاوا میں قدم رکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ سلطان آ گنگ نے اسلامی قوانین نافذ کئے اور لوگوں کی زندگی کو اسلامی سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اس کا نصب العین یہ تھا کہ انڈونیشی جزائر کو متحد کر کے ایک ملک اور ایک قوم بنا دیا جائے جس کی حکومت' معاشرت اور تہذیب وثقافت کی اساس اسلام ہو۔ 1645ء میں سلطان کی وفات کے بعد اُس کے نااہل جانشین ہمنگ کورت اوّل نے اس کی تمام مساعی پر پانی پھیر دیا۔ اس نے قدیم ہندو رسوم ورواج کو پھر زندہ کیا اور ولندیزیوں سے معاہدہ کر کے انہیں متعدد مراعات دے دیں۔ رفتہ رفتہ ولندیزیوں کا تسلط بڑھتا گیا' حتیٰ کہ 1755ء میں ماترم کی یہ سلطنت ولندیزیوں کے زیر اقتدار دو ریاستوں' سورا کارتا اور یوگ یکارتا میں منقسم ہوگئی۔

سماٹرا اور جاوا کے علاوہ بورنیو' سلولیسی اور مالوکا میں مسلمانوں کی کئی سلطنتیں قائم ہوئیں۔ بورنیو میں بنجرماسین' سکدانہ اور برونی کی سلطنتوں نے شہرت حاصل کی۔ اسلام کی اشاعت اور اسلامی سلطنتوں کے قیام سے انڈونیشیا میں زندگی کا ہر شعبہ متاثر ہوا۔ یہاں کے لوگوں پر ہندو تہذیب اور ہندو دھرم کا بڑا گہرا اثر تھا۔ مسلمان ہونے کے بعد وہ اسلام کے شیدائی بن گئے۔ اگرچہ قدیم رسم و رواج اور تہذیب و معاشرت کی کئی چیزیں باقی رہ گئیں' لیکن بنیادی طور پر اُن کی حالت بدل گئی۔ عقائد ونظریات میں ایک اساسی تبدیلی پیدا ہوئی۔ حکومت اور معاشرت میں اصلاح ہوئی۔ ذات

پات کی تقسیم ختم ہوئی۔ تہذیب وثقافت کا انداز بدلا۔ فنونِ لطیفہ نے نئی شکل اختیار کی۔ علم وادب اور زبان میں اسلامی رنگ آ گیا اور دین سے وابستگی نے ملی مقاصد اور جذبات واحساسات میں ہم آہنگی پیدا کر دی۔

ان سلطنتوں کے قیام کا زمانہ اقوامِ مغرب کی آمد کا زمانہ تھا۔ گویا انڈونیشیا کی یہ سلطنتیں ہندوستان کی مغلیہ سلطنت کی معاصر تھیں۔ مغربی اقوام کی عسکری طاقت اور جدید ترین اسلحے کا مقابلہ کرنا بہت دشوار تھا۔ اس کے باوجود بعض حکمرانوں نے اپنی آزادی کی حفاظت کے لئے پوری طاقت سے مقابلہ کیا اور آچے کی سلطنت تو بیسویں صدی کے اوائل تک مغربیوں سے برسرِ پیکار رہی۔

مغربی طاقتوں کی آمد

جزائر انڈونیشیا قدیم زمانے ہی سے ''گرم مسالوں کے جزائر'' کے نام سے مشہور تھے اور دور دراز کے ممالک مثلاً عرب، ہندوستان اور چین کے تاجر ان سے تجارت کرتے تھے۔ 1292ء میں مارکوپولو چین سے لوٹتے وقت سماٹرا آیا تو یورپی اقوام پہلی مرتبہ ان جزیروں سے آشنا ہوئیں۔ 1498ء میں واسکوڈی گاما نے راس امید کی طرف سے مشرق بعید جانے کا راستہ دریافت کیا تو فرنگی تاجروں کے لئے مشرق کا دروازہ کھل گیا۔ واسکوڈی گاما کی واپسی پر حکومت پرتگال نے لوپیز ڈی سیکوئیرا کو چند تجارتی جہاز دے کر روانہ کیا جو سماٹرا ہوتے ہوئے ملایا کی بندرگاہ ملاکا میں لنگر انداز ہو گیا۔ ملاکا کے سلطان محمد کو ہندوستان میں پرتگالیوں کے کارناموں کا حال معلوم تھا، چنانچہ اس نے تمام جہاز رانوں کو گرفتار کر لیا۔ 1511ء میں شاہ پرتگال کے حکم سے ہندوستان کے پرتگالی گورنر البوقرق نے ملاکا پر حملہ کر کے وہاں پرتگالی حکومت قائم کر لی۔ اس کے بعد وہ انڈونیشیا میں عربوں اور ہندوؤں کی تجارت کو ختم کرنے کے لئے جزائر مالوکا کی طرف بڑھا۔ جزیرہ امبون پر قبضہ کیا اور دوسرے جزائر کے حکمرانوں سے معاہدے کر کے ساحلی علاقوں پر تجارتی کوٹھیوں کے نام سے قلعے تعمیر کر لئے۔ اس نے ترناتے کو اپنا مرکز قرار دیا۔ رفتہ رفتہ پرتگالی ترناتے، تدورے اور دوسرے جزائر پر بھی قابض ہو گئے۔ 1525ء میں ایک ہسپانوی بیڑے نے مالوکا کے چند جزیروں پر قبضہ کر لیا تو پرتگال سے لڑائی چھڑ گئی۔ اس میں ہسپانویوں کو شکست ہوئی اور 1540ء میں وہ یہاں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے۔ 1595ء میں پرتگالی تاجر جاوا پہنچے، لیکن چونکہ وہاں طاقتور سلطنتیں قائم تھیں، اس لئے انہوں نے فی الحال صرف تجارت سے غرض رکھی۔ انہی دنوں میں ولندیزی تاجروں کی انڈونیشیا میں آمد سے ان کے ساتھ جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس کشمکش میں ولندیزیوں کو کامیابی حاصل ہوئی اور جزیرہ تیمور کے کچھ حصوں کے سوا تمام مقبوضہ جزائر پرتگال کے ہاتھ سے نکل گئے۔

اپنے مختصر عہدِ حکومت میں پرتگالیوں کے سامنے صرف دو مقاصد تھے: اوّل گرم مسالے کی تجارت سے زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانا اور دوسرے اپنے مذہب (کیتھولک عیسائیت) کو پھیلانا۔

کو زور دوسرے پرتگالی افسر بے حد متعصب' تند خو اور بے رحم تھے اور اُن کا طرزِ عمل نہایت جابرانہ تھا۔ پھر بھی انہوں نے یہاں کے تمدن کو ایک حد تک متاثر کیا۔ یورپی طرز کے مکانات کی تعمیر' جہاز سازی اور جہاز رانی کے نئے طریقے' یورپی طرزِ تعلیم اور تمباکو' مکئی اور کوکو وغیرہ کی کاشت انڈونیشیا نے ان سے سیکھی۔

ولندیزیوں کا عہد حکومت

سترہویں صدی ہالینڈ کا عہد زریں تھا' ثقافتی زندگی اور مادّی دولت دونوں کے اعتبار سے۔ یہ دولت زیادہ تر انڈونیشیا سے چلی آ رہی تھی' جہاں ولندیزی تاجر اپنے ملک سے پچیس گنا بڑی سلطنت کی بنیاد رکھ رہے تھے۔

ولندیزی تاجروں نے سب سے پہلے 1598ء میں انڈونیشی ساحل پر قدم رکھا۔ ان جزیروں سے تجارت اتنی منافع بخش ثابت ہوئی کہ متعدد نئی تجارتی کمپنیاں وجود میں آ گئیں اور پانچ سال کے مختصر عرصے میں 70 سے زیادہ ولندیزی جہاز وہاں پہنچے۔ لیکن جلد ہی نہ صرف تجارتی رقابت نے ان کمپنیوں کو ایک دوسرے سے جھگڑنے پر مجبور کر دیا' بلکہ دیسی حکمرانوں اور پرتگالیوں سے بھی باقاعدہ جھڑپیں شروع ہو گئیں۔ اس صورت حال کے پیش نظر ولندیزی حکومت کے حکم سے ''ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی'' قائم کی گئی' جسے مشرقی ممالک سے تجارت کی اجارہ داری اور متعدد مراعات کے علاوہ بحری اور بری فوج رکھنے' قلعے بنانے' نوآبادیاں بسانے' جنگ' صلح اور معاہدے کرنے' سکے ڈھالنے اور عاملہ' عدلیہ اور مقننہ کے جملہ اختیارات دے دیئے گئے۔

انڈونیشی حکمرانوں میں سے سلطان بانتن نے سب سے پہلے ولندیزیوں کو تجارتی مراعات دی تھیں' لیکن جلد ہی ان کی خودسری نے سلطان کو سختی پر مجبور کیا اور ولندیزی بانتن سے جکارتا چلے گئے۔ وہاں انہوں نے امیر جکارتا کے حکم کے خلاف ایک قلعہ تعمیر کرنا شروع کیا۔ امیر نے سلطان سے مدد چاہی اور ان دونوں کی فوجوں سے ولندیزی شکست کھا کر امبون چلے گئے۔ بدقسمتی سے 1619ء میں یہ دونوں فرماں روا آپس میں الجھ کر تباہ ہو گئے۔ ولندیزی واپس آ گئے اور انہوں نے قلعہ پھر تعمیر کر لیا اور اس کے گرد بٹاویا کا شہر بسایا۔ اب وہ جاوا کی سب سے بڑی سلطنت ماترم کے خلاف سازشیں کرنے لگے' جس کے دانشمند با حوصلہ فرماں روا سلطان آگنگ نے فوج کشی کر کے قلعہ مسمار کر دیا اور ولندیزیوں کو جاوا سے نکال دیا۔ سلطان آگنگ کی وفات کے بعد ولندیزیوں کی پھر بن آئی اور نئے حکمران سے ہر طرح کی مراعات حاصل کر کے انہوں نے اپنے قدم بڑی مضبوطی سے جما لئے۔

اب وہ دوسرے جزائر کی طرف متوجہ ہوئے اور ان پر آہستہ آہستہ قابض ہوتے چلے گئے' مثلاً مکاسر (1614ء)' باندرا (1612ء)' تدورے (1654ء)' ہلما ہیرا (1676ء)' ترناتے' امبون' بوردا' سیرام (1683ء)' نیوگنی (1685ء)' بورنیو (1733ء)' بالی (1743ء)'

تیمور (1749ء)۔1755ء میں سلطنت ماترم کو ولندیزیوں کے زیر اقتدار دو ریاستوں میں تقسیم کر دیا گیا اور یوں تقریباً ایک سو سال میں پورے مجمع الجزائر پر اُن کا تسلط قائم ہو گیا۔ انہوں نے مجمع الجزائر کو چھ صوبوں (امبون' باندرا' ترناتے' مکاسر' مالوکا اور مادورا) میں تقسیم کر کے بٹاویا کو اپنا مرکز مقرر کیا۔

انقلاب فرانس (1789ء) کے بعد ہالینڈ پر فرانس کا قبضہ ہو گیا (1795ء)۔ فرانس کے شاہی خاندان نے انگلستان میں پناہ لی اور ہالینڈ میں جمہوریہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ نئی حکومت نے کمپنی کو توڑ کر اُس کی تمام املاک اور سمندر پار کے مقبوضات کو اپنی تحویل میں لے لیا (1798ء)۔ ادھر نپولین سے برطانیہ کی جنگ چھڑ گئی۔ 1811ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ منٹو نے ایک طاقتور بیڑا شرق الہند کی طرف روانہ کیا' جس نے ملایا پر قبضہ کرنے کے بعد مجمع الجزائر سے ولندیزیوں کو نکال دیا۔ 1816ء تک برطانوی حکومت کی طرف سے سٹیمفورڈ ریفلز (Stamford Raffles) یہاں کا گورنر رہا۔ اسے ''بابائے سنگاپور'' کہا جاتا ہے' اور اس کے نام پر انڈونیشیا میں پیدا ہونے والا سب سے بڑا پھول ''ریفلز'' کہلاتا ہے۔ اس کا مختصر دورِ حکومت اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس نے ایک مستحکم انتظامیہ اور عدلیہ قائم کرنے کے علاوہ بعض مفید زرعی اصلاحات بھی نافذ کیں۔ ولندیزی دور میں عوام کو اپنی ساری پیداوار مقررہ نرخوں پر جاگیرداروں اور امراء کے ذریعے حکومت کے حوالے کرنا پڑتی تھی۔ ریفلز نے براہِ راست کاشت کاروں سے رابطہ پیدا کیا اور یوں وہ ایک حد تک امراء کے ظلم و ستم سے بچ گئے۔ اس کے علاوہ اس نے ملک کی تعلیمی ترقی اور معاشرتی اصلاح پر بھی توجہ کی' جسے ولندیزیوں نے کبھی قابل اعتنا نہیں سمجھا تھا۔

ہالینڈ میں نپولین کے زوال کے بعد ایک بار پھر قدیم شاہی خاندان کی حکومت قائم ہو گئی۔ 1816ء میں ایک عہد نامے کی رو سے سیلون' ملایا اور شمالی بورنیو پر برطانیہ کا' اور جاوا' سماٹرا وغیرہ مشرقی جزائر پر ہالینڈ کا قبضہ و اقتدار تسلیم کر لیا گیا۔ رفتہ رفتہ انڈونیشیا کے مختلف جزیرے ہالینڈ کے تصرف میں آ گئے۔ سماٹرا میں خاصے عرصے تک ان کا مقابلہ کیا گیا' بالخصوص آچے کے حریت پسند 1907ء تک جنگ میں مصروف رہے' لیکن بالآخر تمام انڈونیشی جزائر پر ہالینڈ کی استعماری حکومت قائم ہو گئی اور اُن کا نام ولندیزی شرق الہند رکھا گیا۔

1848ء میں ہالینڈ کی پارلیمنٹ نے ''قانونِ شرق الہند'' منظور کیا' جس کے مطابق گورنر جنرل کو تاج کا نمائندہ اور اس کے سامنے جوابدہ ٹھہرایا گیا۔ پانچ ولندیزی اور دو انڈونیشی ارکان پر مشتمل گورنر جنرل کی کونسل (Raad von Indie) تشکیل دی گئی۔ حکومت کے سات شعبے مالیات' اقتصادی امور' مواصلات' تعمیرات' تعلیم' عدالت اور مذہبی امور قائم کیے گئے' جن میں آگے چل کر جنگی امور اور مال گزاری کے دو اور شعبوں کا اضافہ کر دیا گیا۔ مقبوضہ علاقہ آٹھ صوبوں اور 36

ریزیڈنسیوں میں منقسم تھا۔صوبے کا حاکم اعلیٰ گورنر تھا اور اس کی حدود میں واقع دیسی ریاستوں پر بھی گورنر کی نگرانی قائم تھی۔شروع شروع میں ولندیزی دیسی حکمرانوں کے توسط سے حکومت کرتے تھے' جن کی تعداد 282 تھی۔ ہر ریاست میں ولندیزی ناظم مقرر تھا اور دراصل وہی ریاست کا حقیقی حکمران ہوتا تھا۔رفتہ رفتہ دیسی حکمرانوں کے اختیارات سلب ہوتے گئے اور 1907ء میں انہیں ایک معاہدے پر دستخط کرنا پڑے' جس کی رو سے گورنر جنرل انہیں مقرر اور معزول کر سکتا تھا اور اس کے احکام کی تعمیل ان پر فرض تھی۔ ولندیزی شرق الہند میں عدالتی نظام دو حصوں میں منقسم تھا۔ اگر کسی مقدمے میں سب فریق ملکی ہوتے تو دیسی عدالت میں مقامی قانون (عادات) کے مطابق سماعت ہوتی تھی اور اگر ایک فریق بھی ولندیزی' یورپی یا چینی ہوتا تو ولندیزی عدالت میں ولندیزی قانون کے مطابق۔تمام عدالتیں عدالتِ عالیہ کے ماتحت ہوتی تھیں۔ چونکہ ''عادات'' کی بنیاد رسوم و رواج' معاشرتی ضروریات اور مذہبی اثرات پر ہے' اس لئے مختلف عدالتوں کے اختیارات' دائرہ عمل اور طرزِ کار میں یکسانی نہ تھی' جس سے طرح طرح کی پیچیدگیاں پیدا ہوتی رہتی تھیں۔

1915ء میں فوکس راد (Voksraad) کے نام سے ایک نئی کونسل قائم کی گئی' جس کے ارکان کی تعداد 38 تھی۔ اس کی حیثیت محض مشاورتی مجلس کی تھی' جس سے گورنر چاہتا تو مشورہ کر لیتا۔1922ء اور 1925ء میں ارکان کی تعداد اور اختیارات میں اضافہ کیا گیا' لیکن عوام سیاسی حقوق سے محروم ہی رہے۔ 1927ء میں کونسل 61 ارکان پر مشتمل تھی' جس میں ملکی 30 تھے' لیکن ان میں سے 20 حکومت نامزد کرتی تھی۔

ولندیزیوں کا مقصد تھا کہ جزائر شرق الہند میں تجارتی اجارہ داری حاصل کر کے زیادہ سے زیادہ دولت کمائی جائے۔اس کے لئے مقامی حکمرانوں کی طاقت ختم کر کے اپنا اقتدار قائم کرنا ضروری تھا۔ شروع شروع میں اتنے وسیع ملک پر براہِ راست قبضہ کر کے حکومت کا انتظام چلانا ان کے بس میں نہ تھا' لہٰذا انہوں نے حکمرانوں کی نااہلی اور باہمی ناچاقی سے فائدہ اٹھایا اور طرح طرح کی ریشہ دوانیوں سے مختلف ریاستوں پر اثر قائم کرتے گئے۔ بالآخر یہ صورت پیدا ہو گئی کہ حکمران ان کے آلۂ کار بن گئے اور وہ بھی اُن کے محدود مفادات کی حفاظت کرنے لگے۔ رعایا کے مفاد کا کسی کو خیال نہ تھا اور وہ دوہری چیرہ دستی کا شکار بنے رہے۔اس کے علاوہ ولندیزیوں کی حکمت عملی سے مقامی امراء اور عہدے داروں کا ایک نیا طبقہ ظہور میں آیا' جو اپنی دولت اور عہدوں کو ولندیزیوں کا عطیہ سمجھتے ہوئے عوام کے مقابلے پر ہمیشہ اپنے غیر ملکی آقاؤں کا دم بھرتے تھے۔ انہی کی طرح چینی تاجر بھی ولندیزیوں کے منظورِ نظر تھے۔ برائے نام قیمت پر کل پیداوار کی خرید' جبری بیگار' محصولوں اور ٹیکسوں کی بھرمار اور طرح طرح کی کاروباری پابندیوں نے عوام کی معاشی حالت تباہ کر کے رکھ دی۔ ادھر زراعت کا جو جابرانہ نظام قائم کیا گیا وہ کاشت کاروں کے لئے حد درجہ تباہ کن تھا۔اس کے مطابق

1877ء سے 1915ء تک امراء موروثی جاگیریں پا کر حکومت کے ایجنٹ بنے رہے اور کاشت کار مجبور تھے کہ ایجنٹ جس چیز اور اس کی جتنی مقدار کی کاشت کا حکم دیں' اس کی تعمیل کریں اور پوری پیداوار ایجنٹ کی من مانی قیمتوں پر فروخت کر دیں۔ اس کا لازمی نتیجہ افلاس اور فاقہ کشی تھا۔ لوگ مجبور ہو کر اپنی اراضی بیچنے لگے' جسے بہت کم قیمت پر ولندیزی خریدتے چلے گئے۔ اس طرح ولندیزیوں کے وسیع ''فارم'' وجود میں آئے' جہاں مقامی باشندوں کو نہایت معمولی اجرت پر ملازم رکھا گیا اور اس کے علاوہ تعمیری کاموں کے لئے بیگار بھی لازمی قرار پائی۔ عوام کی مالی حالت کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ 1940ء میں چالیس ہزار گلڈر سے زیادہ سالانہ آمدنی والوں میں 220 ولندیزی' 48 چینی اور صرف 4 انڈونیشی تھے۔ دس ہزار گلڈر تک سالانہ آمدنی والوں میں 17226 ولندیزی' 2556 چینی اور 1534 انڈونیشی تھے۔ یہ امراء کی حالت تھی' ورنہ عوام کی فی کس اوسط آمدنی 6 روپے سے زیادہ نہ تھی۔ صنعت و حرفت میں انڈونیشیوں کا کوئی دخل نہ تھا۔ تعلیم صرف طبقہ امراء کے چند افراد تک محدود تھی۔ 1940ء میں صرف 1786 انڈونیشی طلبہ ہائی سکول کی تعلیم پا رہے تھے۔ جکارتا کے لاء کالج اور آرٹس کالج اور بندونگ کے ٹیکنیکل سکول میں ان کی مجموعی تعداد صرف 40 تھی۔ تعلیم یافتہ انڈونیشی زیادہ سے زیادہ کلرکی حاصل کر سکتے تھے۔ اعلیٰ درجے کی ملازمتوں پر 1940ء میں صرف 221 انڈونیشی فائز تھے۔ ولندیزیوں نے اپنے پرتگالی پیش روؤں کی طرح عیسائیت کی تبلیغ کو بھی اپنی حکومت کے مقاصد میں اہم جگہ دی۔ اس میں اُن کا سیاسی مفاد بھی مضمر تھا' کیونکہ ان کا خیال تھا کہ لوگوں کے عیسائی ہونے سے ان کا اقتدار مستحکم ہو جائے گا۔ غرض کہ جزائر شرق الہند میں ولندیزیوں نے اپنے سیاسی اور معاشی مفاد کے تحفظ کے لئے جو حکمتِ عملی اختیار کی وہ عوام کے ہر ممکن استحصال پر مبنی تھی۔

یہاں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ولندیزیوں کی روش نو آبادیوں میں برطانویوں سے بالکل مختلف تھی۔ انگریز اپنی ایشیائی نو آبادیوں میں زندگی کا بہترین حصہ گزارنے کے باوجود اپنے وطن کے خواب دیکھتے اور چھٹیاں تک ولایت میں جا کر گزارنا پسند کرتے تھے۔ اس کے برعکس انڈونیشیا میں آباد ہونے والے ولندیزیوں نے صحیح معنی میں اسے اپنا وطن بنا لیا' بالکل اسی طرح جیسے یورپ سے آنے والے مختلف ممالک کے باشندوں نے امریکہ کو۔ آزادی کے وقت کئی ولندیزی گھرانے وہاں 150 برس سے آباد تھے۔ ان لوگوں کو آج بھی یہ احساس ہے کہ انڈونیشیوں نے ان سے ان کا ملک چھین لیا' جس کی انہوں نے ساڑھے تین سو برس کی جدوجہد سے کایا پلٹ دی تھی۔ انہوں نے زراعت کے میدان میں نئے نئے تجربات کئے۔ بوگور میں زرعی تحقیق کا مرکز قائم کیا۔ 1711ء میں کافی کی پیداوار شروع ہوئی جو اٹھارہویں صدی کے اواخر میں اہم ترین برآمدی فصل بن گئی۔ آسام کی چائے کی کاشت کا کامیاب تجربہ ہوا اور اس پر اتنی توجہ دی گئی کہ آج چائے پیدا کرنے والے ملکوں

میں انڈونیشیا تیسرے نمبر پر ہے۔

انیسویں صدی میں شمالی سماٹرا کے جنگل صاف کر کے اعلیٰ سائنسی طریقوں سے کام لیتے ہوئے تمباکو کی کاشت کی گئی' جسے آج دنیا بھر میں ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے۔ بیسویں صدی کے وسط میں مغربی افریقہ سے روغنی کھجور اور جنوبی امریکہ سے سیمل (ریشمی کپاس) اور سنکونا کے پودے منگوا کر وسیع پیمانے پر اُن کی کاشت کی گئی۔ بوگور میں طرح طرح کے تحقیقی تجربات کے بعد اعلیٰ قسم کا ربڑ پیدا کیا جانے لگا۔ کاکاؤ اور سیال کی کاشت بطور خاص کی گئی۔ کساوا سے بھی ولندیزیوں ہی نے انڈونیشیا کو آشنا کیا تھا' جو آج چاول اور مکئی کے بعد اُن کی بنیادی غذا بن چکی ہے۔ ولندیزیوں کا ایک بڑا کارنامہ یہ تھا کہ جنگلوں کو صاف کر کے کاشت کے لئے وسیع رقبے نکالے گئے۔ دلدلوں کو سائنسی تجربات کے بعد زراعت کے قابل بنایا۔ صنعت اور تجارت کو توسیع دی گئی۔ ماہی گیری پر اتنی توجہ دی گئی کہ جگہ جگہ تالابوں اور دھان کے کھیتوں میں مچھلیاں پالی جانے لگیں۔ ماہرین ارضیات نے طرح طرح کی معدنیات کا سراغ لگایا۔ پٹرولیم' قلعی' باکسائٹ' نکل' مینگنیز' نمک' آیوڈین اور چونے کے علاوہ سونے اور چاندی کی بھی کانیں دریافت ہوئیں۔ نئے نظامِ آبپاشی نے بعض علاقوں کو دنیا کا سب سے زیادہ زرخیز خطہ بنا دیا۔ مختصر یہ کہ ملک کے تمام قدرتی وسائل دریافت کئے گئے اور ان سے بدرجۂ اتم فائدہ اٹھایا گیا۔

اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اپنے طویل دورِ حکومت میں ولندیزیوں نے صرف اپنی نفع اندوزی پیش نظر رکھی' جبکہ عوام کی فلاح و بہبود سے انہیں کوئی غرض نہ تھی۔ اگر کبھی ملک میں اصلاحات بھی نافذ کیں تو مقصد عوام کی بہبود کے بجائے اپنے اقتدار کا استحکام تھا۔ غرض کہ انہوں نے ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا جس سے انڈونیشی بنیادی انسانی حقوق سے بہرہ ور ہوتے یا اپنے پاؤں پر کھڑے ہو سکتے۔

[خود اعتمادی اور خود اختیاری حاصل کرنے کے لئے انڈونیشی عوام کو برعظیم پاک و ہند کے عوام کی طرح غیر ملکی سامراج سے آزادی حاصل کرنے کے لئے سخت اجتماعی جدوجہد کرنا پڑی۔ انڈونیشیا کی تحریک آزادی کا بیان آئندہ شمارے میں ملاحظہ کیجئے!]

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن

تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجئے۔

مکمل نظر ثانی اور اضافوں کے ساتھ آٹھواں ایڈیشن

ایمانیات وعبادات، قران وسنت، حدیث، تفسیر، فقہ، تہذیب وثقافت، ادبیات، فنون، علوم، مشاہیر، تاریخ، جغرافیہ، مقامات، شہر ومما لک

شاہکار

اسلامی انسائیکلوپیڈیا

مرتب: سید قاسم محمود

پہلی مرتبہ رنگین اٹلس، سینکڑوں رنگین تصاویر، معلومات افروز نقشے، شجرے اور خاکے۔

ردیف وار ترتیب، میں ڈیڑھ ہزار سالہ تاریخ پر مشتمل چار ہزار سے زیادہ عنوانات، مضامین اور ان کا مکمل اشاریہ

سات ایڈیشن ایک جلدی صورت میں بھی بہت وزنی لگتے تھے۔

یہ آٹھواں ایڈیشن انتہائی خوبصورت اور مضبوط دو جلدوں میں شائع کیا گیا ہے۔

جلد اول ودوم، مکمل سیٹ 2400 روپے

الفیصل ناشران وتاجران، غزنی سٹریٹ۔ اردو بازار۔ لاہور

Phone: 7230777 Fax: 09242-7231387
http://www.alfaisalpublishers.com
e-mail: alfaisal_pk@hotmail.com

گزشتہ بیس سال سے مسلسل شائع ہونے والا

پاکستانی بچوں کا سب سے بڑا دینی رسالہ

ماہنامہ **کوثر** لاہور

ماہنامہ ''کوثر'' کا ایک ایک صفحہ بچوں کی صحیح تعلیم، اُن کی اعلیٰ تربیت، کردار و اخلاق کا بلند معیار پیدا کرنے کے لئے وقف ہے۔ چھوٹے چھوٹے معلوماتی مضامین، تاریخ اسلام کے سبق آموز واقعات اور کہانیاں بھی ایسی شاندار جو بچوں کو قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارنے کے لئے ایک مضبوط بنیاد فراہم کرتی ہیں۔

ضخامت: 64 صفحات، قیمت فی شمارہ: 10 روپے، سالانہ زرتعاون: 100 روپے

مدیر: ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ 72 عمر دین روڈ، سن پورہ لاہور، ٹیلی فون: 7281939

KHALID TRADERS

IMPORTERS - INDENTORS - STOCKISTS & SUPPLIERS OF WIDE VARIETY OF BEARINGS, FROM SUPER - SMALL TO SUPER - LARGE

NATIONAL DISTRIBUTION NTN BEARINGS

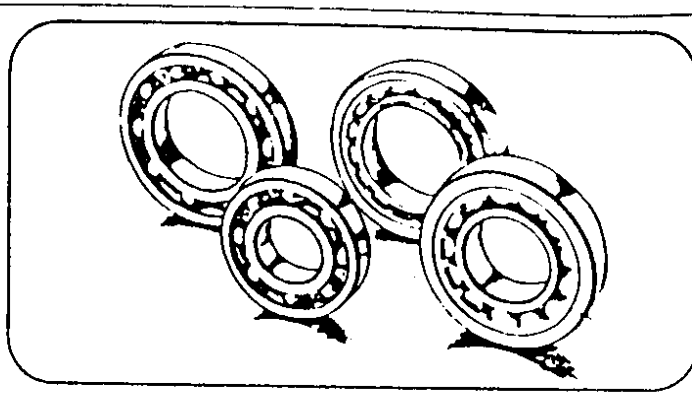

PLEASE CONTACT

Opp. K.M.C. Workshop, Nishtar Road, Karachi-74200, Pakistan
G.P.O. Box # 1178 ***Phones*** : 7732952 - 7730595 ***Fax*** : 7734776 - 7735883
E-mail : ktntn@poboxes.com

FOR AUTOMOTIVE BEARINGS : ***SIND BEARING AGENCY***, 64 A-65 Manzoor Square Noman St Plaza Quarters Karachi-74400(Pakistan)
Tel : 7723358-7721172

LAHORE : 5 - Shahsawar Market, Rehaman Gali No. 4, 53-Nishtar Road, Lahore-54000, Pakistan. Phones. 7639618,7639718,7639810, Fax: (42) : 763-9918

GUJRANWALA: 1-Haider Shopping Centre, Circular Road, Gujranwala Tel : 41790-210607

WE MOVE FAST TO KEEP YOU MOVING